www.shibliinternational.com

October 2019

ISSN: 2581-9216

ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد

Urdu Monthly SADA E SHIBLI Hyderabad

ایڈیٹر مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

10/- روپے

Issue 20: شمارہ _Vol:2 جلد

اکتوبر: Oct : 2019

ماہنامہ حیدرآباد

صدائے شبلی

مدیر: ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نائب مدیران: ڈاکٹر سراج احمد انصاری ☆ ڈاکٹر عبدالقدوس ☆ ابوہریرہ یوسفی

مجلس مشاورت:

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، استاذ الاساتذہ حضرت رحمٰن جامی
پروفیسر مظفر علی شہہ میری، پروفیسر محسن عثمانی ندوی
پروفیسر ابوالکلام پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی،
ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، مولانا ارشاد الحق مدنی،
مولانا محمد مساعد ہلال احیائی، اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ
محمد سلمان انجینئر

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محمد رفیق، ڈاکٹر حمران احمد، ڈاکٹر جاوید کمال
ڈاکٹر مختار احمد فردین، ڈاکٹر غوثیہ بانو، ڈاکٹر سید امام
حبیب قادری، ڈاکٹر سمیہ تمکین، ڈاکٹر فاروق احمد بھٹ
ڈاکٹر محمد زبیر، ڈاکٹر مصطفیٰ خان، ڈاکٹر محمد فضیل ندوی،
ڈاکٹر مصلح الدین نظامی، ابوہریرہ ایوبی، محسن خان

MOHD MUHAMID HILAL
A/c: 52023475202
Ifsc: SBIN0020413
Micr: 500002311 Branch: Dabeerpura Hyd

قیمت فی شمارہ: 20
سالانہ: 220 - بیرونی ممالک: 50/ امریکی ڈالر
خصوصی تعاون: 1000

ماہنامہ "صدائے شبلی" حیدرآباد میں مقالہ نگاران سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف حیدرآباد کی عدالت میں ہوگی

محمد محامد ہلال (اونر، پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر) نے دائرہ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر حیدرآباد تلنگانہ سے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ

MOHD MUHAMID HILAL #17-6-352, B1, 2nd Floor,Bafana Complex,
Near Asfya Masjid Dabirpura Road, Purani Haveli,Hyderabad- 500023. T.S

فہرست مضامین

۱	اداریہ	ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	۵
۲	اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	علامہ شبلی نعمانیؒ	۶
۳	نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر	مولانا عمر احمد عثمانی	۷
۴	حمد باری تعالیٰ	ڈاکٹر ولا جمال العسیلی	۷
۵	دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	۸
۶	قرآن کو اللہ کی کتاب ماننے کا بنیادی تقاضہ	مولوی صفوۃ الرحمٰن	۱۲
۷	مولانا آزاد کی فکر، وسیاسی بصیرت	ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی	۱۴
۸	رام کی فریاد بھکتوں کے نام (نظم)	حکیم صوفی سید شاہ خیر الدین قادری	۱۷
۹	ڈاکٹر رفیع الدین ناصر اور ان کی خدمات	مولانا انصار احمد معروفی	۱۸
۱۰	غزل	شاہ نواز ہاشمی	۲۰
۱۱	اقبال فہمی (اقبال کی اردو شاعری میں ذکر حسینؓ)	احمد نور عینی	۲۱
۱۲	فردین نامہ (نظم)	ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی	۲۳
۱۳	ککرالہ میں نعت گوئی کی روایت	محمد عامل بدایونی	۲۴
۱۴	محمد مہدی واصف مدراسی: حیات وخدمات	ڈاکٹر ابراہیم عمری	۳۰
۱۵	اسلم عمادی سے گفتگو (انٹرویو)	ڈاکٹر محسن جلگانوی	۳۲
۱۶	اردو ادب میں ڈرامے میں مقام	سید حسن عباس	۳۸
۱۷	گاندھی جی اردو ادیبوں اور شاعروں کی نظر میں (ریویو)	ابو ہریرہ یوسفی	۴۱

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کے خصوصی معاونین

ابو سفیان اعظمی، مقیم حال ممبئی.....الحاج **محمد منیر الدین عرف ولی**، آغا پورہ حیدرآباد

ڈاکٹر سید **جلیل حسین** ایم ڈی (علیگ) ٹولی چوکی حیدرآباد.....الحاج **محمد عبد الستار** سیکھ ویلج سکندرآباد حیدرآباد

علی میاں احمد پٹھان رائے گڑھ (مہاراشٹر).....**علی احمد عبد اللہ** کونچالی، رائے گڑھ (مہاراشٹر)

الحاج **رئیس احمد اقبال** انجینئر، سیکھ ویلج سکندرآباد حیدرآباد.....**محمد عبد الماجد** ایڈوکیٹ، سکندرآباد، حیدرآباد

جناب قاضی **فیض الدین**، اپر توڑیل، مہاڈ، رائے گڑھ مہاراشٹرا۔ ڈاکٹر **شہباز احمد**، پروفیسر گورنمنٹ نظامیہ طبی کالج

چارمینار، حیدرآباد.....مولانا **محمد عبد القادر سعود** نائس جوس سینٹر سکندرآباد، حیدرآباد۔

الحاج **محمد قمر الدین** نبیل کالونی بارکس حیدرآباد

اداریہ

ماہِ اکتوبر جیسے ہی شروع ہوتا ہے گاندھی جی کی یاد آجاتی ہے اور اس مرتبہ تو گاندھی جی کی ۱۵۰ ارویں سالگرہ تھی۔ گورنمنٹ اس دن باپو کو یاد کرنے کے لیے تعطیل بھی دیتی ہے اور ہندوستان کے تقریباً سبھی چھوٹے بڑے شہروں اور قریوں میں گاندھی جی کے کارنامے کو یاد کر کے انہیں خراجِ عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔ شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد نے اس تاریخی دن کی مناسبت سے ایک قومی سیمینار، جس کا عنوان تھا ''گاندھی جی اردو ادیبوں اور شاعروں کی نظر میں'' کا انعقاد کیا۔ تاکہ گاندھی جی کی حیات اور شخصیت کا اعادہ ہو جائے۔ گاندھی جی ہندوستان اور ہندوستان کے باہر قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں کیونکہ ان کا فلسفہ عدم تشدد، ہندو مسلم، سکھ، عیسائی کا اتحاد، چھوت چھات، ذات برادری سے پرے ہو کر انسانیت کے لیے کام کرنا ان کا مشن تھا۔ وہ سادگی، سچائی، صاف گوئی کو پسند کرتے تھے اور مرتے دم تک وہ اسی افکار پر قائم رہے۔ انہیں ہندوستانی زبان سے محبت تھی انگریزی جاننے کے بعد بھی وہ ذریعہ تعلیم کے معاملے میں ہندوستانی زبان کے حق میں تھے۔ آزادی کے بعد انہوں نے کوئی عہدہ قبول نہیں کیا اور انسانوں کی جستجو میں لگے رہے، مگر انسانی دشمن عناصر نے انہیں گولی ماردی، باپو ڈھیر ہو گئے۔ اسرار الحق مجاز کہتے ہیں ؎

ہندو چلا گیا نہ مسلماں چلا گیا
انسان کی جستجو میں اک انساں چلا گیا

گاندھی جی تو نہیں رہے مگر ان کے افکار و اصول آج بھی زندہ ہیں۔ کچھ فرقہ پرست عناصر قاتل گوڈسے کی جے جے کار کر رہے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ہندوستان مشترکہ تہذیب کا گہوارہ ہے۔ گاندھی جی کے اصول و افکار ہی میں ہندوستان کی ترقی کا راز مضمر ہے۔

آسام کے بعد پورے ملک میں موجودہ حکومت NRC کرا رہی ہے۔ اچھی بات ہے۔ اہم کام کو چھوڑ کر غیر اہم کام میں لگ جانا دانش مندی نہیں ہے اگر مان بھی لیا جائے کسی بنا پر کہ حکومت اس مقصد میں کچھ ملک کے حق میں بہتر کرنا چاہتی ہے تو ٹھیک ہے، مگر وزیر داخلہ کا جو بیان آیا ہے کہ ہندو، سکھ، عیسائی، جین اس NRC سے نہ گھبرائیں اگر وہ رفیوجی بھی پائے جائیں گے تو انہیں اس ملک میں پناہ دیا جائے گا۔ اس بات سے ان کے ارادے بالکل صاف ہو گئے کہ اگر مسلمان پایا گیا تو اسے بھارت چھوڑنا پڑے گا۔ موصوف وزیر داخلہ ہیں اور آئین ہند کا حلف لیا ہے کہ میں سب کو برابر دیکھوں گا۔ ایک ذمہ دار شخص کی زبان سے اس طرح کی باتیں زیبا نہیں دیتی اور یہ ملک کے مخالف ہے، جس سے ہمارا ملک ہندوستان کمزور ہوگا۔

چندر یاستی اردو اکیڈمیوں نے انعامات کا اعلان کیا تو اعلان میں ان لوگوں کا نام بھی شامل تھا جو انعام کے لیے منتخب کرتے ہیں۔ یہ اصول اور اخلاق کے خلاف ہے۔ یہ غلطی تو تھی ہی، غلطی پر غلطی یہ ہوئی کہ لوگ اردو کی بقا کے لیے اور دھاندلی کو روکنے کے لیے میڈیا اور قانون کے ساتھ میدان میں کود پڑے اور ساتھ میں یہ بھی کہہ رہے تھے کہ مجھے بھی ایوارڈ دے دو کیونکہ میری بھی عظیم خدمات ہیں۔ دل کا حال اللہ کو معلوم ہے، لیکن اتنی تو بات طے ہے کہ دونوں صورتوں میں اردو زبان و ادب کا نقصان ہے.....

مختلف موضوعات پر تین درجن سے زائد کتابوں کے مشہور مصنف، ماہر شبلیات، شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ کے سرپرست، دارالمصنفین کے اعزازی رفیق اور صدائے شبلی کے مشیر خاص ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کو یوپی اردو اکیڈمی نے ان کی مجموعی ادبی خدمات کے حوالے سے ''مسعود حسن رضوی ادیب'' انعام برائے تحقیق ۲۰۱۸ء دینے کا اعلان کیا۔ شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد انہیں مبارکباد پیش کرتا۔

مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ شبلی نعمانیؒ

ہند بن ابی ہالہ جو گویا آنحضرت ﷺ کے آغوش پروردہ تھے، وہ بیان کرتے ہیں کہ "آپؐ نرم خو تھے، سخت مزاج نہ تھے، کسی کی توہین روا نہیں رکھتے تھے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر اظہار شکر فرماتے تھے، کسی چیز کو برا نہیں کہتے تھے، کھانا جس قسم کا سامنے آتا تناول فرماتے اور اس کو برا بھلا نہ کہتے، کوئی اگر کسی امرِ حق کی مخالفت کرتا تو آپ کو غصہ آجاتا اور اس کی پوری حمایت کرتے لیکن خود اپنے ذاتی معاملہ پر کبھی آپ کو غصہ آیا اور نہ کسی سے انتقام لیا۔)

مداومتِ عمل: (اخلاق کا سب سے مقدم اور ضروری پہلو یہ ہے کہ انسان جس کام کو اختیار کرے اس پر اس قدر استقلال کے ساتھ قائم رہے کہ گویا وہ اس کی فطرتِ ثانیہ بن جائے، انسان کے سوا دنیا کی تمام مخلوقات صرف ایک ہی قسم کا کام کرسکتی ہے اور وہ فطرتاً اسی پر مجبور ہے، آفتاب صرف روشنی بخشتا ہے، اس سے تاریکی کا صدور نہیں ہوسکتا، رات تاریکی ہی پھیلاتی ہے، وہ روشنی کی علت نہیں، درخت اپنے موسم ہی میں پھلتے ہیں اور پھول ایام بہار ہی میں پھولتے ہیں حیوانات کا ایک ایک فرد اپنے نوعی افعال واخلاق سے ایک سرِ مو تجاوز نہیں کرسکتا لیکن انسان خدا کی طرف سے مختار پیدا ہوا ہے، وہ آفتاب بھی ہے اور رات کی تاریکی بھی، اس کے جوہر کا درخت ہر موسم میں پھلتا ہے اور اس کے اخلاق کے پھول ایام بہار کے پابند نہیں، وہ حیوانات کی طرح کسی ایک ہی خاص قسم کے اعمال واخلاق پر مجبور نہیں، اس کو اختیار دیا گیا ہے اور یہی اختیار اس کے مکلّف اور ذمہ دار ہونے کا راز ہے۔

لیکن اخلاق کا ایک دقیق نکتہ یہ ہے کہ انسان اپنے لیے اخلاق حسنہ کا جو پہلو پسند کرے، اس کی شدت سے پابندی کرے اور اس طرح دائمی اور غیر متبدل طریقے سے اس پر عمل کرے کہ گویا وہ اپنے اختیار کے باوجود اس کام کے کرنے پر مجبور ہے اور لوگ دیکھتے دیکھتے یہ یقین کرلیں کہ اس شخص سے اس کے علاوہ اور کوئی بات سرزد ہو ہی نہیں سکتی، گویا اس سے یہ افعال اس طرح صادر ہوتے ہیں جیسے آفتاب سے روشنی، درخت سے پھل اور پھول سے خوشبو کہ یہ خصوصیات ان سے کسی حالت میں الگ نہیں ہوسکتیں، اسی کا نام استقامتِ حال اور مداومتِ عمل ہے۔

آنحضرت ﷺ اپنے تمام کاموں میں اسی اصول کی پابندی فرماتے تھے، جس کام کو جس طریقہ سے جس وقت آپؐ نے شروع فرمایا، اس پر برابر شدت کے ساتھ قائم رہتے تھے، سنت کا لفظ ہماری شریعت میں اسی اصول سے پیدا ہوا ہے، سنت وہ فعل ہے جس پر آنحضرت ﷺ نے ہمیشہ مداومت فرمائی ہے اور بغیر کسی قوی مانع کے کبھی اس کو ترک نہیں فرمایا، اس بنا پر جس قدر سنن ہیں وہ درحقیقت آپؐ کی استقامتِ حال اور مداومتِ عمل کی ناقابل انکار مثالیں ہیں، آپؐ کے معمولات کا ذکر اس سے پہلے ہوچکا ہے، جس سے یہ معلوم ہوا ہوگا کہ آپؐ کے تمام اخلاق واعمال کس قدر پختہ اور مستحکم تھے کہ کبھی تمام عمر ان میں ایک ذرہ فرق نہیں پیدا ہوا، ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ کے عبادات واعمال کے متعلق حضرت عائشہؓ سے دریافت فرمایا کہ کیا آپؐ کسی خاص دن یہ کرتے تھے، انہوں نے جواب دیا "لا کان عملہ دیمۃ" آپؐ کا عمل جھڑی ہوتا تھا، یعنی جس طرح بادل کی جھڑی برسنے پر آتی ہے تو نہیں رکتی، اسی طرح آپؐ کا حال تھا کہ جو بات ایک دفعہ آپؐ نے اختیار کرلی ہمیشہ اس کی پابندی کی، پھر فرمایا وایکم یستطیع ما کان النبی ﷺ یستطیع، آنحضرت ﷺ جو کرسکتے تھے، وہ تم میں سے کون کرسکتا تھا۔ دوسری روایت میں ہے:

وما کان اذا عمل عملا اثبتہ

جب آنحضرت ﷺ کوئی کام کرتے تو پھر اس پر مداومت فرماتے تھے۔

مولانا عمر احمد عثمانی

نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر

حضرت عائشہؓ کے بارے میں یہ روایت کہ ان کا نکاح ہوا تھا تو وہ چھ سال کی تھیں اور ان کی رخصتی ہوئی تو وہ نو سال کی تھیں۔ بخاری میں آ گئی ہے۔ لیکن اسی بخاری میں یہ روایت بھی موجود ہے کہ سورۃ القمر نازل ہوئی تو حضرت عائشہؓ بچی تھیں اور وہ کھیلتی پھرتی تھیں اور انہیں اس کی آیتیں یاد ہوگئی تھیں اور وہ انہیں دھراتی پھرتی تھیں (ملاحظہ ہو بخاری، ص: ۲۰۴، ج: ۲) سورۃ القمر نبوت کے پانچویں سال نازل ہوئی تھی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کے بعد مکہ مکرمہ میں تیرہ یا پندرہ سال رہے تو اگر سورۃ القمر کے نازل ہونے کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر کم سے کم چھ سال بھی مانی جائے تو ہجرت کے وقت ان کی عمر سولہ، سترہ سال اور رخصتی کے وقت اٹھارہ، انیس سال ہونی چاہئے۔ ورنہ نکاح کی روایت کے مطابق تو (جس کی رو سے ۱۲ھ نبوت یا ۱۴ھ نبوت میں وہ چھ سال کی تھیں) انہیں ۵ھ نبوت میں جب کہ سورۃ القمر نازل ہوئی تھی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی صلب میں ہونا چاہئے تھا۔ بہرحال دونوں روایتیں بخاری کی ہیں۔ جس کی روایت کی آپ چاہیں تغلیط فرمادیں۔ ہم امام بخاریؒ پر پورا پورا حسن ظن رکھتے ہیں۔ ان کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے یہی سمجھتے ہیں کہ قدیم زمانہ میں پریس تو تھے نہیں۔ کتابیں ہاتھوں سے ہی لکھی جاتی تھیں۔ کسی خبیث اور شریر شخص نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ذاتِ گرامی کو اضحوکہ روزگار بنانے کے لیے ست عشرہ (سولہ سال) اور تسع عشرہ (انیس سال) سے دونوں جگہ عشرہ کا لفظ مٹا دیا یا کھرچ دیا اور یہ روایت چل پڑی۔ اس کے بعد کسی اللہ کے بندہ کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ اس کی چھان بین اور تحقیق وتنقید کرتا۔

(فقہ القرآن، ص: ۵۳۱/۵۳۲)

ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی۔ قاہرہ۔ مصر

حمد باری تعالیٰ

خالق، لاثانی خدا تو ہے
بے پناہ قدرت کا مالک تو ہے
خاکی انسان ہم ہیں اور قادرِ مطلق تو ہے
ناقص انسان ہم ہیں اور باکمال تو ہے
گنہگار ہم ہیں اور مہربان تو ہے
قوت ہے ہماری محدود، قوت تری لامحدود ہے
تری عظمت کے مقابلے میں کتنے حقیر ہم ہیں
تری آیاتِ عظمت ہر پہلو سے ظاہر ہوتی ہیں
تری بے پناہ حکمت سے حیران رہ جاتے ہم ہیں
جب تری شاندار تخلیق پر غور کرتے ہم ہیں
تو تری شان کو تخلیق میں دیکھتے ہم ہیں
ترے کرشمے اتنی ہی عیاں ہے
بے زبان تخلیق تری حمد کرتی ہے
حیات کو ختم کرتا ہے اپنی قدرت سے
مردوں کو زندہ کرتا ہے اپنی قدرت سے
اور صرف تو ہی تو ہے
ان کو دوبارہ بحال کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے
ہماری امیدیں ترے ساتھ ہیں
ترے وعدے پر اعتماد رکھتے ہم ہیں
اپنے وعدے میں دیر نہیں کرتا تو ہے
ہماری زندگی سنوارتا ہے اپنی مہربانی سے
گناہوں کو معاف کرتا ہے فراخدلی سے
ہم ایسے خداداد پر غور کرتے ہیں
اور ہمیں یہ فکر کھائے جاتی ہے
کیا تری قربت کے قابل ہم ہیں؟
کیا تری کرم فرمائی کے مستحق ہم ہیں؟
کیا تری عبادت کے لائق ہم ہیں؟
کیا تجھ سے محبت رکھتے ہم ہیں؟
اپنے ساری جان، ساری عقل سے!!

قسط:(۱۷)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ 9838573645

دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ

یحییٰ اعظمی

یحییٰ اعظمی (۱۹۰۶۔۱۹۷۲ء) دبستان شبلی کے ممتاز شاعر تھے۔ ان کی قومی وملی نظموں نے ایک زمانہ میں بڑی مقبولیت پائی۔ سید سلیمان ندوی، عبد السلام ندوی، ابو الکلام آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ ان کی شاعری کے بڑے مداح تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں دادِ سخن دیتے تھے۔ ان کے کلام کے دو مجموعے نواحیات اور نوائے عصر شائع ہوئے، انھیں علامہ شبلی سے بڑی عقیدت تھی، ان کے مجموعہ میں علامہ شبلی پر جو نظم شامل ہے اور جسے راقم الحروف نے اپنی کتاب ''شبلی سخنوروں کی نظر میں'' میں بھی شامل کیا ہے، خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس کا یہ شعر بہت مقبول ہوا:

کہیں صدیوں میں ہوتا ہے یہ فیض خاص ربانی
نہیں اٹھتے ہمیشہ دہر میں شبلی نعمانی

یحییٰ اعظمی نے اپنے ذوق ووجدان کو شبلی وسہیل سے متاثر بتایا ہے۔ نوائے حیات کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''ارباب نظر جانتے ہیں کہ نوائے حیات اس دور ادب کا ایک مرقع ہے جسے حضرت شبلی سے نسبت کا شرف حاصل ہے۔ چونکہ ملک میں نئے ادب کے غلو کے باوجود ابھی شبلی مکتب ادب کے کے ذوق شناس موجود ہیں اس لئے امید ہے ایک معتقد شبلی کی یہ حقیر ادبی کوشش حسن قبول سے محروم نہ رہے گی''۔ (نوائے حیات دیباچہ ص ۲، طبع دوم ۱۹۵۰ء)

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

مولانا سعید احمد اکبر آبادی (۱۹۰۸ء۔ ۱۹۸۵ء) بڑے نامور اہل قلم گذرے ہیں۔ انھوں نے متعدد بلند پایہ کتابیں سپرد قلم کیں۔ وہ علامہ شبلی سے ابتداء عمر سے بہت متاثر تھے، خاص طور پر ان کے ادب وانشا اور طریقہ تحقیق وتصنیف سے جس کا ذکر انھوں نے اپنے خود نوشت مضمون غبار کارواں میں کیا ہے۔

ان کی مشہور کتاب صدیق اکبر ہے جو ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی۔ میرے پیش نظر اس کا ادارہ اسلامیات لاہور کا ایڈیشن ہے جس پر سنہ طباعت ۱۴۱۰ھ لکھا ہوا ہے۔ اصلاً یہ طبع اول کا عکس ہے۔

چونکہ علامہ شبلی نے خلفائے راشدین میں حضرت عمرؓ کی سوانح عمری الفاروق لکھی ہے اور صدیق اکبرؓ سے پہلے الفاروق لکھنے کا سبب بیان کرتے ہوئے مولانا سعید احمد اکبر آبادی لکھتے ہیں:

''اردو زبان میں مولانا شبلی کی کتاب الفاروق جو خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق کے سوانح حیات اور آپ کے کارناموں کا محققانہ تذکرہ ہے اردو زبان کے ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے اور جب تک یہ کتاب موجود ہے مولانا کا نام روشن رہے گا، اگرچہ ترتیب اور اہمیت کے اعتبار سے مولانا کو پہلے حضرت ابو بکر صدیقؓ کا تذکرہ لکھنا چاہئے تھا لیکن حضرت عمرؓ کے دور میں جو عظیم الشان فتوحات ہوئیں اور پھر دہ سالہ مدت خلافت میں آپ نے سیاسی نظم ونسق، اجتماعی وتمدنی، اقتصادی اور سماجی مسائل کے حل

کے سلسلہ میں جو عظیم الشان کارنامے انجام دیئے ان سب کے پیش نظر مولانا نے ہیروز آف اسلام کی تاریخ کا جو پروگرام بنایا تھا اس کے لئے سب سے زیادہ کشش حضرت عمرؓ کے تذکرہ میں ہی تھی اور مولانا نئی نسل کو اسلام کی تاریخ سے متاثر کرنے کا جو جذبہ رکھتے تھے خلفائے راشدین میں اس جذبہ کی تکمیل کا سامان غالباً سب سے زیادہ الفاروق سے ہی ہوسکتا تھا''۔(صدیق اکبر ص ۲۲۔۲۳)

غلام عباس ایم،اے

علامہ شبلی کی زندگی میں اور ان کی وفات بلکہ کلیات شبلی کی اشاعت سے پہلے ان کے اردو کلام کے کئی مجموعے دہلی، علی گڑھ، لکھنؤ اور لاہور سے شائع ہوئے، ان کا ذکر راقم نے آثار شبلی میں کیا ہے، آثار شبلی کی اشاعت کے بعد ایک اور مجموعہ کلام دستیاب ہوا جو مرغوب ایجنسی لاہور سے شائع ہوا ہے۔ سنہ اشاعت درج نہیں ہے، چونکہ علامہ شبلی کے نام کے ساتھ مرحوم لکھا ہوا ہے اس سے واضح ہے کہ یہ ان کی وفات کے بعد شائع ہوا، اس پر کسی مرتب کا نام بھی درج نہیں ہے، البتہ دیباچہ غلام عباس ایم،اے (۱۹۰۹ء۔۱۹۸۲ء) کے قلم سے ہے۔

۱۲ر صفحے کے دیباچے میں غلام عباس نے علامہ شبلی کے اجمالی حالات اور کارناموں کا ذکر تسلسل سے کیا ہے، ان کا انداز بڑا دلآویز اور دلکش ہے، اس سے حیات شبلی کی بعض تاریخوں کی تعیین میں مدد ملتی ہے۔

علامہ شبلی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رکن نامزد کئے گئے تھے، حیات شبلی میں اس کا ذکر رہ گیا ہے۔ سوانح مولانا روم کے سرورق پر رکن رائل ایشاٹک سوسائٹی لکھا ہوا ہے، اس سے ان کی رکنیت کا علم ہوا۔ غلام عباس نے بصراحت لکھا ہے کہ ۱۸۹۴ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رکن نامزد ہوئے۔ (مجموعہ کلام شبلی ص ۸) اسی طرح ایڈمبرا اسلامک سوسائٹی لندن کی ان کی صدارت کے ذکر سے بھی حیات شبلی خالی ہے، راقم کو ماہنامہ الندوہ میں شائع ایک خط سے معلوم ہوا تھا کہ علامہ شبلی اس کے صدر نامزد کئے گئے تھے۔ غلام عباس نے اس کی تاریخ بھی بصراحت ۱۹۰۸ء لکھی ہے۔ (ایضاً ص ۱۰)

غلام عباس نے علی گڑھ کالج سے علاحدگی کا سال ۱۸۹۴ء لکھا ہے جو صحیح نہیں وہ سرسید کی وفات ۱۸۹۸ء کے بعد اسی سنہ میں مستعفی ہوئے۔

غلام عباس نے چھوٹے چھوٹے جملوں میں اس مختصر سے دیباچے میں علامہ کی زندگی اور خدمات کا پورا مرقع کھینچ رہا ہے مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''ان ایام میں ملکی معاملات میں گہری دلچسپی ظاہر کی اورینٹل کانفرنس میں شریک ہوئے، قانون وقف علی الاولاد کے معاملہ کو پریوی کونسل تک پہنچایا۔ اشاعت اسلام کی ایک عظیم الشان اسکیم تیار کی مگر ناکام رہے۔ سلطان ترکی کی طرف سے آپ کا نام نامی مدینہ یونیورسٹی کے واضعین نصاب میں داخل کیا گیا، اسی اثنا میں کاروبار کی زیادتی سے طبیعت کسل مند ہوتی گئی۔ (ایضاً ص ۱۰۔۱۱)

غلام عباس نے اس مقدمہ میں بڑی ادبی اور انشا پردازانہ نثر لکھی ہے، مثلاً سیرۃ النبیؐ کی تالیف، وفات اور پھر ماتم پر ان کے قلم کی ادبیت اور انشا پردازی ملاحظہ ہو، وہ لکھتے ہیں:

''ابھی ایک چنگاری گوشہ دل میں مستور تھی، جس کی صراحت سے دردمند دل کو رشک طور ہونا تھا۔ پیارے نبیؐ کے پیارے حالات لکھنے شروع کئے اور سیرۃ نبوی کی پہلی جلد چھپ کر تیار ہوئی۔ ابھی مرغ جال چیدہ چیدہ ذرات زریں چن ہی رہا تھا کہ فرشتہ غیب نے آواز دی، بس شبلی۔ خرمن سے دانہ اور سمندر سے قطرہ ہی عقل مندوں کے لئے کافی ہوتا ہے۔ تو بھلا ان گنت موتیوں کو کس طرح جمع کرسکتا ہے۔ جس نور کی یہ کرنیں ہیں اس نور کے دہکنے کی تمنا ہے تو چل میرے

ساتھ۔ عاشق جان روانہ ہوئی۔ ۱۸؍نومبر ۱۹۱۴ء کو دنیا چھوڑا اور بہشت کو آباد کیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ منتظر آنکھیں سیرۃ کی تکمیل دیکھتی رہ گئیں۔

اشک پیہم سے دامان عالم تر ہوا۔ شبلی کی وفات سے دنیا میں کہرام مچ گیا۔ ہندوستان، مصر، جرمن، انگلستان میں ماتم ہوا، کسی نے کہا تاریخ کا تنہا جوہری چل بسا۔ تاریخ شاعری کا موجد کوچ کر گیا، علم کلام کا عقاب آشیان تحقیق خالی چھوڑ گیا، انشا پردازی کا شہسوار غائب ہوگیا، نہیں وہ آفتاب جو ہنگامہ مشرق کی سرخی میں نمودار ہوا تھا، محاربہ مغرب کی لالہ کاری میں غروب ہوگیا''۔ (ایضاص ۱۱۔۱۲)

نثر کے اس افسانوی انداز سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کہیں مشہور افسانہ نگار غلام عباس تو نہیں؟

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

سید صباح الدین عبد الرحمٰن (۱۹۱۱ء۔۱۹۸۷ء) ایک بڑے مورخ تھے، ان کے قلم سے متعدد گراں مایہ کتابیں نکلیں اور مقبول ہوئیں، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی (۱۹۰۴ء۔ ۱۹۷۴ء) کے بعد وہ دارالمصنفین کے ناظم ہوئے، اس حیثیت سے بھی انھوں نے علم وادب کی بڑی خدمات انجام دیں، علامہ شبلی سے والہانہ عشق انہیں ورثہ میں ملا تھا، چنانچہ انھوں نے ان پر کئی مقالات لکھے اور ایک مختصر سوانح ''مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر'' کے عنوان سے لکھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے مجموعہ مقالات ''مقالات سلیمان'' جلد اول کے دیباچے میں لکھا ہے کہ:

''استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ کے علم وفن میں بڑی بوقلمونی تھی، وہ نہ صرف ایک عالم دین تھے بلکہ سیرت نگار بھی، مفسر بھی، محدث بھی، متکلم بھی، ادیب بھی، شاعر بھی، نقاد بھی اور مورخ بھی تھے مگر وہ اپنے استاذ علامہ شبلی کے اس قول کو برابر نقل فرماتے تھے کہ اصلی فن تو تفسیر، حدیث اور علم کلام ہے، ادب وتاریخ تو علمی دسترخوان کی محض چٹنی ہے جو زبان کا ذائقہ بدلنے کے لئے دسترخوان پر ہوتی ہے، اسی طرح ادبی وتاریخی مضامین محض علمی ذائقہ بدلنے کے لئے لکھے جاتے ہیں، ان کا عمل اسی پر رہا''۔
(مقالات سلیمان اول ص ا)

چونکہ یہ قول سید صاحب کے حوالہ سے ہے اس لئے اس پر شبہہ ظاہر کرنا بھی درست نہیں، تاہم جب خیال آتا ہے کہ علامہ شبلی کی تمام حیثیتوں میں سب سے بڑی اور بنیادی حیثیت مورخ اسلام کی ہے تو اس قول پر شبہہ ہونے لگتا ہے۔

سید شہاب الدین دسنوی کی کتاب شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں میں ڈاکٹر خلیق انجم کے مقدمہ کے ساتھ ان کا بھی پیش لفظ شامل ہے، ڈاکٹر خلیق انجم نے یہ اعتراض کیا تھا کہ علامہ شبلی پر جو رکیک اعتراضات ہوئے ان کے معتقدین مداحوں اور تلامذہ نے ان کا جواب نہیں دیا، سید صباح الدین صاحب اس کی وجہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی کے عزیز شاگردوں نے ان نکتہ چینوں کی تحریری جمناسٹک کے رد میں اپنے قلم کو آلودہ نہیں کیا۔ ان کے سکوت سے ان نکتہ چینوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ ان کی آبروریزی کی یہ مہم کامیاب رہی اور انھیں کی تقلید میں کبھی کبھی دوسرے نکتہ چیں بھی اپنی بدنفسی کا اظہار کرتے رہے ہیں، انہی باتوں سے آزردہ ہوکر سید شہاب الدین دسنوی نے زیر نظر کتاب مرتب کی۔ ان کے تحقیقی مواد، مدلل، مہذب، مؤثر اور مربوط انداز بیان سے ظاہر ہوگا کہ انھوں نے مایہ ناز بزرگوں کی خوبیوں کے قدردانوں، ان کے رتبے اور عظمت پر فخر کرنے والوں اور ان کی عزت وآبرو کو اپنا سرمایہ زندگی سمجھنے والوں کی طرف سے فرض کفایہ ادا کردیا ہے۔ امید ہے کہ اب تک کردار کشی کا جو زہر پھیلایا گیا ہے اس کے لئے یہ کتاب تریاق ثابت ہوگی''۔
(شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں ص ۱۲۔۱۳)

علامہ شبلی نے مستشرقین کے اسلام اور مسلمانوں پر الزامات کا رد کرنے اور ان کے جوابات لکھنے کا کام مدۃ العمر انجام دیا، الجزیہ، کتب خانہ اسکندریہ، حقوق الذمیین سے سیرۃ النبی تک نہ جانے کتنے الزامات کی تردید کی۔ دراصل وہ اسلام کی عظمت پر کوئی داغ دھبہ برداشت نہیں کر سکتے تھے، ان کی وفات کے بعد ان کے تلامذہ بھی یہ فریضہ انجام دیتے رہے۔ ۱۹۸۲ء میں دارالمصنفین نے اسلام اور مستشرقین کے عنوان سے ایک بین الاقوامی سمینار منعقد کیا جس میں دنیا بھر کے ممتاز اہل قلم نے شرکت کی اور مقالات پیش کئے، چنانچہ اس موضوع پر ماہنامہ معارف میں متعدد مقالات کے علاوہ سات جلدوں میں اس موضوع پر مقالات دارالمصنفین کی طرف سے شائع کئے گئے، اسلام اور مستشرقین کے حوالہ سے یہ بہت بڑا علمی ذخیرہ دارالمصنفین نے فراہم کیا ہے۔ اس موضوع پر علامہ شبلی نے جو کچھ لکھا تھا اس کا بھی ایک مجموعہ شائع کیا گیا ہے، اسے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے بانی مولوی محمد شفیع کے لائق صاحبزادے مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی نے مرتب کیا ہے، جس کی اشاعت سے پہلے ان کا انتقال ہوگیا، یہی وجہ ہے کہ اس کا دیباچہ دارالمصنفین کے اس وقت کے ناظم سید صباح الدین عبد الرحمٰن نے لکھا ہے۔ اس کے مشمولات کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس میں مولانا کی تصنیفات کے کچھ اقتباسات ہیں اور کچھ وہ مضامین ہیں جو ان کے مقالات کے مجموعوں میں شائع ہو چکے ہیں، ان کو ایک علاحدہ جلد میں شائع کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مستشرقین کے اعتراضات اور ان کے جوابات کا یکجا مطالعہ کرنے سے مستشرقین کی گمراہ کن تحقیقات واستدلالات کا صحیح اندازہ ہوجائے گا، یہ تحریریں بہت پہلے لکھی گئی ہیں لیکن ان کی تازگی اور شادابی میں کوئی فرق نہیں ہوا ہے۔ یہ مولانا کی زبان اور طرز ادا کی خوبی ہے''۔
(اسلام اور مستشرقین ج ۴ ص ج)

علامہ شبلی کو اپنے عہد میں کن مستشرقین کا سامنا تھا اور ان کی کیا حیثیت تھی اس کی وضاحت کرتے ہوئے صباح الدین صاحب لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی کے زمانہ میں دلی کالج اور بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے سربراہ ڈاکٹر اسپرنگر اور یوپی کے گورنر سر ولیم نے ہندوستان میں یہ مہم چلا رکھی تھی، ہندوستان سے باہر ڈاکٹر جے اے مولر، ڈاکٹر ویل، وان کریمر، برتھالمی، رینان، سینٹ ہلیر، نولدیکی، ولہاؤسن، گولڈ زیہر وغیرہ یورپ میں اس قسم کی فتنہ انگیزیوں میں مشغول تھے اور جب انگلستان کی سب سے بڑی یونیورسٹی کے پروفیسر مارگولیتھ اٹھے تو مصر وشام کے عیسائیوں نے بھی ان کی تقلید میں اس کام کو شروع کیا۔ جس میں سب سے زیادہ بدنام الہلال کا ایڈیٹر جرجی زیدان تھا۔ (ایضاص الف)

ان کے مقابلہ کیلئے صف اسلام سے علامہ شبلی نکلے اور بقول سید صباح الدین عبدالرحمٰن:

''مولانا شبلی نے شیر دل بن کر مستشرقین کی تدلیسات، تلبیسات، تحریفات، دور از قیاسات، غلط قسم کی معلومات اور غیر مستند معلومات کی پردہ دری اچھی طرح کی''۔ (ایضا)

علامہ شبلی نے مستشرقین کی قسمیں بتائی ہیں، صباح الدین صاحب نے ان کی انھیں کی تحریروں سے نشاندہی کی ہے۔ علامہ شبلی نے ان کے اعتراضات کی جو بے وقعتی بتائی تھی اور ان کی ملمع سازیوں کی وضاحت کی تھی اس کی تفصیل لکھی گئی ہے، پھر سید صباح الدین صاحب نے آخر میں لکھا ہے کہ:

''مولانا شبلی نے ایسے حریفوں کے اعتراضات کے جوابات دینے میں طیش وغضب سے کام نہیں لیا بلکہ بہت ہی ٹھنڈے طریقہ سے عالمانہ اور محققانہ انداز میں ان کی تلبیسات، تدلیسات اور اعتراضات کا رد کیا ہے، جیسا کہ اس مجموعہ کے مضامین سے ظاہر..... (بقیہ، ص: ۳۱ پر)

مولوی صفوۃ الرحمٰن صابرؔ۔ حیدرآباد

قرآن کو اللہ کی کتاب ماننے کا بنیادی تقاضہ

قرآن کو اللہ کی کتاب ماننے والوں پر لازم تھا کہ سب سے پہلے اسی کتاب کی طرف رجوع ہو کر اپنی اس تباہی وبربادی کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کرتے، ایسا کرنے کی بجائے تحریر وتقریر کے ذریعہ عارضی اور وقتی لوٹ مار، آتش زدگی، قتل وغارت گری، زندہ جلادینے کے واقعات کی تصویر کشی کر کے ملت کے خون کو گرمایا جارہا ہے، لیکن کسی نے بھی ابدی زندگی کے ان دردناک اور شدید ترین عذاب کی طرف امت کی توجہ مبذول کروانے کی سعی نہیں کی جو ان کے غلط وجھوٹ عقائد کے بدلے میں بھگتنا پڑے گا۔ ملحوظ رہے کہ لاعلم وبے خبر کافروں، ظالموں، بت پرستوں پر دنیا میں عذاب نازل نہ کرنا لیکن دعویدارانِ ایمان وحاملانِ کتاب وسنت کو اہلِ باطل کے ہاتھوں مبتلائے عذاب کر دینا ایمان کے دعویداروں کے لیے ابدی عذاب کا پیش خیمہ ہے۔ امت کے بگاڑ کو مختصراً غور وفکر کے لیے پیش کیا جارہا ہے، دینِ اسلام، دین حنیف، دین قیم، دین واصب کو شریعت مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ اور ان کے علم کو علمِ ظاہر طریقت (شریعت کے مقابلہ میں اعلیٰ مقام) حقیقت: طریقت سے اعلیٰ مقام، معرفت: دین کا سب سے اعلیٰ ترین درجہ جس کے علم کو علمِ لدنی، علم سینہ بہ سینہ علمِ باطن میں تقسیم کر کے کتاب وسنت کو منقولات (وہ باتیں جو صرف نقل اور بیان ہوتی چلی آئی ہوں) اور فلسفہ، کلام، منطق کو معقولات (عقل سے کام لینے کی باتیں) قرار دے کر قرآن وحدیث کی بجائے مثنوی، گلستان بوستان، انوار سہیلی اور لٹریچر وغیرہ جیسی کتابیں پڑھنے والے کو عالم سمجھا جانے لگا۔

شیطان اور اس کے شاگرد ازل ہی سے دین حنیف کو بگاڑنے کی کوششوں میں لگے ہیں۔ حفاظتِ الٰہی کی بناء پر قرآن کے الفاظ میں جب تحریف کرنا ممکن نہ رہا تو رسولؐ سے مسلمانوں کی جو محبت ہے، اس کی آڑ میں ہزاروں جھوٹی روایات وضع کی گئیں اور صحیح احادیث میں غلط سلط باتیں اس طرح ملادی گئیں کہ ان کا معلوم کرنا قرآن کے بغیر ممکن نہیں رہا۔ واضح رہے کہ محدثین نے اس بگاڑ کو مزید پھیلنے سے روکنے کے لیے اپنی اپنی بساط کے مطابق لاکھوں احادیث جمع کیں پھر ان اصحاب نے انتخاب مدت کے لیے راویوں کی ثقافت کو اولین بنیاد قرار دیا اور تدوین کی، حالانکہ ہدایتِ الٰہی کے مطابق قرآن کی بنیاد بنانا چاہئے تھا چنانچہ علماء نے درایت کے اصول مرتب بھی کئے ہیں، لیکن احادیث کو ان اصولوں پر جانچنے کا کام ابھی تک نہیں کیا گیا۔ اہلِ عرفان، سیر الی اللہ، سیر فی اللہ، باقی باللہ، فانی فی اللہ، عین اللہ، انا الحق بننے کے لیے انسانی صفات کو الٰہی صفات یا الٰہی صفات کا پَرتَو قرار دے کر ''وحدۃ الوجود، وحدۃ الشہود'' ہمہ اوست کے فلسفوں کی چکر میں مبتلا ہیں۔ انسان کو اللہ کا خلیفہ قرار دے لیا گیا (جبکہ انسان کو اللہ نے زمین پر خلافت دینے کی بات کہی ہے) اور عشق حقیقی تک پہنچنے کے لیے عشقِ مجازی کو پہلا زینہ بنالیا گیا، اپنی غلط باتوں کو تنقید سے بچانے کے لیے کشف والہام اور خواب کو آڑ بناتے ہوئے اپنے ملہم ہونے کا ادعا کیا۔ تزکیۂ نفس، تطہیر قلب کے لیے اللہ ورسولؐ کے قانون کے خلاف اہلِ تصوف نے صحرا نوردی، گوشہ نشینی، مراقبے، چلہ کشی، اوراد ووظائف، ذکر ویاد، ضربات اور

جینے کے بیسیوں طریقے جن میں سے نقشبندیہ، سہروردیہ، قادریہ، چشتیہ تو مشہور ومعلوم ہیں، گھڑے گئے خانقاہیں بنائی گئیں۔ کسی نے تعلق باللہ قائم کرنے قوالی وسماع کو لازمی ذریعہ قرار دے لیا، عوام کی ترغیب اور رابطہ کے لیے لنگر چلائے گئے، ان باتوں سے مسلم عوام اس قدر متاثر ہیں کہ اہلِ علم حضرات نہ صرف ان کی ہاں میں ہاں ملانے میں اپنی قباوسلامتی سمجھی بلکہ اپنا مقام برقرار رکھنے کے لیے قرآن وحدیث سے مروجہ عقائد کی صحت میں دلائل بھی فراہم کرنے لگے اور کررہے ہیں، مثلاً امام غزالیؒ جو اپنے زمانہ کی سب سے بڑی مسلم یونیورسٹی میں قرآن وحدیث کے سب سے بڑے پروفیسر تھے لیکن اپنے تزکیۂ نفس وتطہیر قلب کی خاطر اس خدمت کو چھوڑ کر ۱۵ربرس تک جنگلوں میں اَلْعَطَشُ ''میں پیاسا ہوں'' پکارتے رہے پھر جب انہوں نے اہلِ تصوف کے تزکیۂ نفس وتطہیر قلب کے طریقوں پر عمل کیا تب جا کر ان کے نفس کا تزکیہ اور قلب تطہیر ہوئی حالانکہ قانونِ الٰہی تو یہ ہے ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ (البقرہ۲۳۲) ''ارشادِ الٰہی ہے کہ اے ایمان والو! یہ میری وہ ہدایتیں ہیں جن پر عمل کروگے تو ہی ان کے نفس کا تزکیہ ہوسکے گا اور تمہارے قلب کی تطہیر ہوگی'' ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَهُمْ (النور۳۰) ''میری ان ہی ہدایتوں پر عمل کروگے تو ہی نفس کا تزکیہ ہوسکے گا'' آج بھی اللہ کے ان احکام کے خلاف ذکرویاد، چلے، مراقبے مشاغل دینی بنے ہوئے ہیں اور اسی کی تبلیغ واشاعت جاری ہے، گمراہی سے بچنے کے لیے اللہ نے حسب ذیل باتوں سے بچنے کا تاکیدی حکم دیا ہے۔

غلو

لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ (النساء۱۷۱) ''اپنے دین میں غلومت کرو'' غلو بچنے کا طریقہ بھی بتلادیا، وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ (النساء۱۷۱) ''اللہ کے متعلق حق کے سواء کوئی اور بات مت کہو''۔ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ (انعام۹۳) ''تم اللہ کے متعلق غیر حق بات کہتے تھے'' لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ (مائدہ۷۷) ''اپنے دین میں ناحق بات کہہ کر غلومت کرو''۔ وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (اعراف) ''اور یہ کہ حرام کیا گیا تم پر کہ اللہ کے متعلق ایسی باتیں کہو جس کا تم کو علم نہیں'' اس بگاڑ سے بچنے کی ایک مختصر وجامع تدبیر یہ بتائی گئی وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (اسرائیل۳۶) ''اس بات کے پیچھے مت پڑ جس کا تجھے علم نہیں یا جس کی تجھے ضرورت نہیں'' ان ہدایتوں کی خلاف ورزی جن وجوہ سے ہوسکتی ہے نہ صرف ان کو بیان کیا بلکہ ساتھ ہی ان کا انجام بھی واضح کردیا، وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ، اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (انعام) ''اور اس سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں جو اللہ پر جھوٹ باتیں گھڑے اور اللہ کی باتوں کو جھٹلائے، ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا'' مثلاً نبی کریم ﷺ کو وجہِ تخلیق کائنات یا نوری کہنا اور علیؓ کو مولائے کائنات، اللہ کے رسول کو پاک کہنا جبکہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات سبحان (پاک) ہے اور پیغمبر معصوم ہوتے ہیں، ان کے سواء سب کے سب انسان غیر معصوم ہیں، پھر اماموں کو معصوم قرار دینا وغیرہ۔ اہلِ ایمان کے قلوب سے ابدی زندگی کی تباہی کا خوف نکالنے انبیاء مقربان بارگاہِ الٰہی کی شفاعت کا جھانسہ دلایا گیا اور عقیدت ومحبت کے عنوان پر بہت سارے مشرکانہ عقائد بدعات ایجاد کرلیے گئے، یہاں تک کہ دشمنانِ اسلام نے شرک وبدعات کے اعمال کو ذریعہ معاش بنا کر مسلمانوں کو ان میں پھنسا دیا۔ عاشورخانے، چلے، درگاہ، قبریں وآستانے، صندل وعرس، عودوگل، فاتحہ خوانی، وغیرہ وغیرہ اسلامی کاموں کے لیے زینات وتنخواہیں دی گئیں، مزید بے فکری پیدا کرنے کو ایصالِ ثواب کے نام سے زیارت، دسواں، بیسواں، چہلم، برسی، رجب کنڈے، گیارہویں، بارہویں، محرم کے شربت، کھچڑی، ماتم اور سلام کا نیکی ہونا سمجھا دیا گیا۔

ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی ۔ اسسٹنٹ پروفیسر و صدر شعبہء اردو، گورنمنٹ ڈگری اینڈ پی۔جی کالج سدی پیٹ

مولانا آزاد کی فکر، وسیاسی بصیرت

مولانا ابوالکلام آزاد (1888-1958ء) کو فیاض قدرت نے غیر معمولی صلاحیتیں بخشی تھیں، ادب، صحافت، انشاء پروری، خطابت، شاعری، تصنیف و تالیف، عصری علوم و افکار اور مذہبی علوم، علوم معارف میں وہ مجتہدانہ شان رکھتے تھے۔ انھوں نے خداداد ذہانت، وسیع مطالعہ اور زبان وقلم کے امتیازی اسلوب اور سحر بیانی سے ملک وملت اور ابنائے وطن کی بہترین قیادت کی ہے، اور اپنی قائدانہ صلاحیتوں سے آزادی کے بعد بھی ملک کی شاندار علمی خدمات انجام دیتے رہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی پوری زندگی انتہائی خلوص و دردمندی کے ساتھ ملک وملت کی رہنمائی کے لئے وقف تھی، انھوں نے مذہبی وعصری علوم و افکار اور سماجی و سیاسی حالات کا عمیق تجزیاتی وتقابلی مطالعہ کیا۔ اور قوم ووطن کی اصلاح کے لئے فکری وعملی قدم اٹھایا ہے۔

1857ء کی جنگ آزدی کی ناکامی نے ہندوستان میں انگریزوں کے قدم کو مضبوط کردیا، اور مسلمانوں کی تباہی و تاراجی کی نئی داستاں رقم ہوئی، دہلی اور اسکے اطراف تقریباً 6لاکھ مسلمانوں کا قتل ہوا، ہزاروں علماء شہید کر دئے گئے، مسلمانوں کے آٹھ سو سالہ اقتدار کا گہن زدہ سورج غروب ہو گیا اور انگریزوں کے اقتدار کا سورج دنیا کے بیشتر حصہ پر نصف النہار کی طرح جگمگانے لگا، ان حالات میں مسلمان دل شکستہ ہو گئے، ان پر قنوطیت کی کیفیت طاری ہوگئی، ایسے موقع پر سرسید کی تحریک نے مسلمانوں کو کچھ سہارا دیا، سرسید نے اپنی تحریک کے ذریعہ انگریزوں سے مفاہمت اور وفاداری کا راستہ بتایا، سرسید انگریزوں کی تعلیمی، صنعتی اور معاشی ترقی سے متاثر تھے، انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ انگریز اس ملک سے جونک کی طرح چمٹ گئے ہیں، وہ کسی طرح اس ملک کو چھوڑ کر بھاگنے والے نہیں ہیں، اس لئے انگریزوں سے مفاہمت کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔

مولانا آزاد نے ان ہی حالات میں آنکھیں کھولیں، شروع میں وہ بھی سرسید کی افکار سے متاثر ہوئے، لیکن جوں جوں ان کا شعور پختہ ہوتا گیا، انھوں نے سرسید سے ہٹ کر اپنی راہ الگ نکالی، مولانا آزاد نے قرآن وحدیث، سیرۃ نبوی، تفاسیر، تواریخ عالم اور قدیم وجدید علوم وفلسفہ کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا تھا، وہ یقین محکم اور عمل پیہم کی دولت سے سرشار تھے، اس لئے وہ قنوطیت اور مایوسی کا شکار کیسے ہوسکتے تھے۔

مولانا نے دیکھا کہ مسلمانوں کی سیاسی اور مذہبی حالت نہایت غیر مطمئن ہے، یہ سیاست سے الگ رہنے کی پالیسی پر کاربند ہیں، اسلام سے بھی برائے نام تعلق باقی ہے، مولانا آزاد غیر ملکی حکومت کے ہلاکت خیز اثرات سے آگاہ ہو چکے تھے، انھوں نے ان اثرات کو ختم کرنے کا عزم کیا، ان کا سیاسی شعور بیدار ہو چکا تھا، مولانا آزاد نے ''الہلال'' کے ذریعہ مسلمانون کو ایک نئے انداز میں خطاب کیا، ان کے خیالات، نقطہء نظر اور تحریروں میں جدت تھی، ان کا اسلوب دل کی گہرائیوں میں اتر کر اثر کرنے والا تھا، انھوں نے قدامت پسندی اور باطل پرستی کے قلعہ پر بھرپور حملے کئے، الہلال مسلمانوں میں مذہبی انقلاب کا داعی اور نقیب بن گیا، اس نے قومی زندگی کے ہر شعبہ میں قرآن مجید کی تعلیم پیش کی، علماء اور مشائخ بھی ان کی آواز سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی نے کہا: ''ہم سب اصلی کام بھولے ہوئے تھے، الہلال نے یاد دلایا۔'' مولانا شوکت علی کہا کرتے تھے: ''ابوالکلام نے ہم کو ایمان کا راستہ دکھایا۔'' ڈاکٹر اقبال الہلال کی تحریروں سے بہت متاثر تھے، ''اسرارِ خودی'' اور ''رموز بے خودی'' الہلال ہی کی صدائے باز گشت ہے۔ (ڈاکٹر ادریس احمد۔ آئینہء ابوالکلام:27)

مولانا آزاد نے الہلال اور البلاغ میں اگرچہ ہر نوع کے مضامین لکھے، ادبی، ثقافتی، تاریخی اور سیاسی موضوعات پر اپنی جولانیء طبع کے جوہر دکھائے، مگر آیات قرآنی کی تفسیر اور ان کے موضوع استعمال میں آپ نے جو جدت اختیار کی، وہ آپ کی مایہ ناز خصوصیت ہے، آیات کی تفسیر میں آپ نے ایمان افروز تصور پیش کیا، جو بحث و مناظرہ سے ہٹ کر تمام نوع انسانی کو مؤثر ترین اسلوب میں خدا کی سچی تعلیم سے روشناس کراتا ہے۔

مولانا راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ قومی یکجہتی اور ہندو مسلم اتحاد کے بڑے علم بردار تھے، گاندھی جی ان کی دیش بھگتی سے بہت متاثر تھے، ان کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ ''ان میں دیش بھگتی اسی طرح پختہ ہے، جس طرح اسلام میں ان کا عقیدہ۔'' چنانچہ خطبہء آگرہ میں آپ نے ارشاد فرمایا تھا:

''ہندوستان کے لئے، ہندوستان کی آزادی کے لئے، صداقت وحق پرستی کے بہتر اور اعلیٰ فرض ادا کرنے کے لئے، ہندوستان کے ہندو و مسلمان کا اتفاق اور ان کی یکجہتی ضروری ہے۔''

مولانا آزاد قومی یک جہتی کے بالمقابل ملک کی آزادی سے دستبردار ہونے کو تیار ہو سکتے تھے، مگر آپس کے اتحاد اور قومی یک جہتی کو قربان کرنے کے لئے کسی طرح آمادہ نہیں تھے، وہ ہمارے عدم اتحاد کو عالم انسانیت کا نقصان قرار دیتے تھے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے لئے مولانا آزاد کا نظریہ یہ تھا کہ ''میثاق مدینہ'' کی طرز پر بقائے باہم کے اصول کے مطابق امن وامان کے ساتھ وہ پکے مسلمان بن کر ہندوستان میں رہے، مولانا نے بارہا بڑے فخر کے ساتھ خود کو مسلمان اور ہندوستان کی متحدہ قومیت کا اٹوٹ حصہ قرار دیا، مولانا نے رام گڑھ کانگریس اجلاس مارچ 1940ء میں اپنے ایک خطبہ میں فرمایا تھا:

''میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں، اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثہ میں ہیں، میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں، اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم وفنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے، اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں، بحیثیت مسلمان میں مذہبی اور کلچرل دائرہ میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں، اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی اس میں مداخلت کرے۔'' (جدید ہندوستان کے معمار: ابوالکلام آزاد:155)

مولانا آزاد کا یہ بیان ماضی کی طرح آج بھی اہمیت کا حامل ہے اور آج کے حکمرانوں کے لئے دعوت فکر وعمل ہے کہ وہ مسلمان کی نفسیات، خصوصیات، مذہبی وتہذیبی شناخت اور ان کی تاریخی وتہذیبی پس منظر میں ان کے مسائل کا جائزہ لیں اور ان کے مذہبی اور کلچرل دائرہ میں مداخلت کی ناپاک کوشش سے باز رہیں۔

مولانا مسلمانوں کو پورے فخر واعتماد اور مساویانہ حقوق کے ساتھ ہندوستان میں رہنے کی ترغیب دیتے ہیں، اور ہندوستان میں رہائش کا پیدائشی حق خیال کرتے ہیں:

''اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس سرزمین کے باشندوں کا مذہب رہا ہے، تو اسلام بھی ایک ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب چلا آتا ہے، جس طرح آج ایک ہندو فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے اور ہندو مذہب کا پیرو ہے، ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندوستانی ہیں اور مذہب اسلام کے پیرو ہیں۔''

مولانا کی تعلیمات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ بہ

یک وقت مسلمانوں کی دینی وسیاسی رہنمائی کو اپنا فریضہ خیال کرتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کا رشتہ عملی اور سیاسی زندگی میں قرآن و حدیث اور شریعت مطہرہ سے مضبوط و استوار رہے، انہیں ہندستان میں با وقار اور پر سکون زندگی حاصل ہو، ان کے اندر خود اعتمادی، خود آگہی اور خوش اعتقادی پیدا ہو، وہ ہندوستان میں فخر کے ساتھ رہیں، اور ہندوستان کی ترقی وخوشحالی میں سرگرم قائدانہ رول ادا کرے، چنانچہ ایک خط میں انھوں نے اپنے پیغام کو اس طرح واضح کیا ہے:

''1912ء سے میرع دعوت مسلمانوں کے لئے یہی رہی ہے کہ جہاں تک ملک کی سیاسی جد وجہد کا تعلق ہے، انہیں بلا کسی شرط کے شریک ہونا چاہئے، اور یہ کہہ کر شریک ہونا چاہئے کہ وہ محض ادائے فرض کے لئے شریک ہو رہے ہیں، اس لئے شریک نہیں ہو رہے ہیں کہ ہندوؤں نے انہیں ان کے مستقبل کی طرف سے مطمئن کر دیا ہے، مستقبل کے لئے ان کا تمام تر اعتماد اپنی ہمت اور خود اعتمادی پر ہونا چاہئے، جب تک ان میں یہ احساس باقی رہے گا کہ ان کے حقوق ہیں اور وہ ضائع نہیں ہونے چاہئیں، دنیا کی کوئی طاقت نہیں کہ ضائع کر سکے۔'' (نوادرِ ابوالکلام مرتب ظہیر احمد خان ظہیر، 30 جون 1937ء)

آج مسلمانوں کے دینی مدارس حکومتوں کے نشانہ پر ہیں، جب کہ ان ہی دینی مدارس کے علماء وفضلاء نے جنگ آزادی کی قیادت کی، تحریک ترک مولات میں کانگریس، مولانا آزاد اور مہاتما گاندھی کا بھر پور ساتھ دیا، مدرسہ عالیہ کلکتہ کے طلباء نے شاندار عمارت، عالی شان ہاسٹل اور بہترین سامان آرائش و آسائش کو محض احکام الٰہی کی پابندی اور سچے ہندوستانی کی حیثیت سے چھوڑ دیا، ترک مولات کی راہ میں ہر طرح کی تکالیف بر داشت کیں، بھوک پیاس کی سختی جھیلی اور جاڑے کی طویل راتیں ٹھنڈی زمین پر گزاری ہیں۔ ان طلباء کے لئے مولانا آزاد کی کوششوں سے مدرسہء اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا، اس کی افتتاحی تقریب (13 دسمبر 1920ء) میں مولانا آزاد کے ساتھ گاندھی جی بھی موجود تھے، مولانا آزاد نے مہاتما گاندھی کو مخاطب کرتے ہوئے اس مدرسہ کے طلباء کے دینی وقومی جذبہ کی تعریف کی، انہیں علم کا حقیقی شیدائی اور خدا کی پاک امانت کا حامل قرار دیا:

''میں آپ کے علم میں یہ حقیقت لانی چاہتا ہوں کہ علم کی اس عام توہین وتذلیل کی تاریکی میں سچی علم پرستی کی ایک روشنی برابر چمکتی رہتی ہے، یہ ہندوستان کے طالبین علم کی وہ جماعتیں ہیں، جو اسلام کے قدیم مذہبی علوم اور مذہبی زبان کے فنون مختلف عربی مدرسوں میں حاصل کر رہی ہیں، آپ یقین کیجئے بجا طور پر یہی ایک جماعت علم کی سچی پرستار کہی جا سکتی ہے۔''

مولانا آزاد نہ صرف ایک مذہبی وقومی رہنما تھے، بلکہ حقیقت میں وہ ایک آفاقی رہنما اور آفاقی پیغام کے علمبردار تھے، وہ پوری دنیا سے ظلم واستبداد اور نو آبادیاتی استحصال کا خاتمہ چاہتے تھے، وہ برٹش گورنمنٹ کو نہ صرف ایشیاء ومشرق بلکہ تمام کرۂ ارضی کو اللہ کی عالمگیر صداقت کے لئے سب سے بڑا خطرہ تصور کرتے تھے۔ (ملاحظہ ہو: خلافت کمیٹی آگرہ کا خطبہء صدارت)

مارچ 1947ء کو ایشیا کے بائیس ممالک کے تقریباً پچیس نمائندوں کی کانفرنس نئی دہلی میں بلائی گئی تھی، جس میں ایشیائی بھائیوں کو مل بیٹھ کر مستقبل کے امن وامان، اتحاد اخوت اور باہمی میل جول کی بنیاد رکھنے کی دعوت دی گئی تھی، اس موقع پر مولانا آزاد نے اپنے بے مثال بصیرت افروز خطاب میں کہا تھا:

''اب وقت آ گیا ہے کہ قدم بڑھایا جائے، اب عرصہ تک ہماری دنیا خوابوں اور تصورات تک محدود نہیں ہوگی، بلکہ حقائق کی ایک زندہ تصویر بنے گی، انسانی اتحاد کے مقاصد کے لئے وقت اور فاصلہ کا سوال ختم ہو گیا ہے، لہٰذا یہ ایشیائی کانفرنس ایک عالمگیر کلچر کانفرنس کا خاکہ تیار کرے، جس میں صرف مشرق ہی نہیں، بلکہ مغربی اقوام بھی شرکت کرے۔... ایسی کلچرل کانفرنس میں تنگ نظر سیاست کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے،

آل انڈیا صوفی علماء کونسل کی جانب سے الحاج نواب میر کاظم علی خان قومی صدر امیڈکر نیشنل کانگریس کی حج کی واپسی پر تہنیت کی گئی
تصویر میں مولانا عبدالکریم، صوفی عقیل احمد انصاری، ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی، حافظ وقاری محمد علی قادری، حکیم سید شاہ صوفی خیر الدین قادری صوفی،
الحاج نواب میر کاظم علی خان، صلاح الدین نیر، طاہر رومانی وغیرہ کو دیکھا جاسکتا ہے

اور نہ فرقہ وارانہ اور جماعتی تعصب پیدا کرنے کی گنجائش ہے۔"

مذکورہ اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا ایک عبقری اور عہد آفریں شخصیت کے مالک تھے، ان کی تعلیم اور ان کا پیغام آفاقی ہے، جو انسان کو انسان سے نفرت کے بجائے محبت تعصب کے بجائے رواداری اور دشمنی کے بجائے دوستی، اخوت اور بھائی چارہ کا سبق سکھاتا ہے۔ وہ علامہ اقبال کے مثالی مرد مومن کی عملی تفسیر تھے، جن کی گفتار اور کردار میں اللہ کی برہان تھی، جن کے طوفان سے دریاؤں کے دل دہل جاتے تھے:

ہو محبت یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

غرض مولانا ابوالکلام آزاد جیسی فکری صلاحیت کا حامل، دور اندیش سیاست داں، عزم وہمت کا کوہ گراں، زبان وقلم کا شہسوار، فکر وعمل کا مجاہد اور مجتہد قدرت کا خاص عطیہ ہوتا ہے، جو مدتوں میں پیدا ہوتا ہے:

عمر ہا در کعبہ وبت خانہ می نالد حیات
تا زبزم عشق یک دانائے راز آید بروں

حکیم صوفی سید شاہ خیر الدین قادری۔ حیدرآباد

رام کی فریاد بھکتوں کے نام

اے بھگت تیری بھگتی سے بدنام ہوگیا
انسانیت سے شرمندہ اب رام ہوگیا
شیطان کا پجاری ہے تو لے کے میرا نام
پاپی کی بھی زباں پہ سیہ رام ہوگیا
کہتی ہے دنیا مجھ کو مریادا پرشوتم
اے پاپیو میں رسوا سر عام ہوگیا
ملتی تھی شانتی اسے جپتا جو میرا نام
اب نام میرا باعث آلام ہوگیا
صدیوں سے مجھ کو کہتا ہے مسلم امام ہند
جے جے سے تیری آج میں بدنام ہوگیا
سکھ شانتی کا میں نے دیا تھا تمہیں پیام
دہشت کا تو پجاری صبح و شام ہوگیا
انسانیت کا درس ہے صوفی کی آرزو
جھگڑا رحیم و رام کا تو عام ہوگیا

مولانا انصار احمد معروفی۔ پورہ معروف مئو (یوپی)

ڈاکٹر رفیع الدین ناصر اور ان کی خدمات

جہد مسلسل اور پیہم محنت کے ساتھ اگر فضل خداوندی بھی شامل رہے تو انسان ترقی کے اعلیٰ مناصب پر فائز ہوجاتا ہے، کامیابیاں اس کے قدم چومتی ہیں، اور وہ انسان لوگوں کے لیے ایک نمونہ بن جاتا ہے، ایسی ہی ایک محترم شخصیت ڈاکٹر رفیع الدین ناصر صاحب کی ہے؛ جن کا تعلق تاریخی شہر اورنگ آباد مہاراشٹر سے ہے۔ صورت کے اعتبار سے جہاں وہ قدرت کی فیاضی کا اعلیٰ نمونہ ہیں، وہیں سیرت و کردار کے تعلق سے بھی ایک مثالی شخصیات میں سے ہیں، اپنے عزیز طلبہ کی رہنمائی کا جذبہ تو ہر ایک استاد کے دل میں ہوتا ہے، کہ وہ اپنے طلبہ کی بہترین کردار سازی کرے اور اسے ترقی کے حصول میں صحیح اور بروقت رہنمائی کر کے آسانیاں پیدا کرے، مگر عام لوگوں کے لیے بھی ایک اچھا معلم بن کر جہاں تک ہوسکے، کسی بھی کام کی برآوری میں تعاون پیش کرنا، صحیح مشورہ دینا، بلکہ اس کے لیے خود جدوجہد کرنا؛ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی اور سب میں یہ جذبۂ پرخلوص موجود نہیں ہوتا، بلکہ اللہ حفاظت فرمائے، بہت سے بڑے لوگ صحیح مشورہ کی درخواست پر کردار کشی کے ساتھ راہ کے پر پیچ ہونے اور کام نہ ہونے کی پیش گوئی کر کے امیدوار کو مایوس اور اس کو آگے بڑھنے کے لیے رکاوٹ کا سبب بن جاتے ہیں، یا غلط مشورے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

ڈاکٹر رفیع الدین ناصر ماشاء اللہ ابھی باحیات ہونے کے ساتھ صحت منداور فعال ہیں، تدریس کے ساتھ ان کا قلم بھی مستقل رواں دواں رہتا ہے، اب تک ان کے کلک گہر بار سے تقریباً تیس تصنیف منظر عام پر آچکی ہے، اسی کے ساتھ مقامی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر ۸۶؍سے زیادہ مقالات پیش کر چکے ہیں، نیز ۲۵؍تحقیقی مقالوں کی بین الاقوامی اور قومی سطح پر اشاعت بھی عمل میں آچکی ہے، اس طرح اپنے قلم سے سائنس کے مضامین کو وہ اردو اور انگریزی زبان میں برابر پیش کرتے چلے آئے ہیں، زیادہ تر مقالات ماہنامہ ''سائنس'' نئی دہلی۔ ماہنامہ ''اردو دنیا'' نئی دہلی، سہ ماہی ''سائنس کی دنیا'' نئی دہلی کے ساتھ اخبارات کی زینت بنتے رہتے ہیں، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے سائنسی پینل کے وہ ممبر بھی رہ چکے ہیں، اب تک ان کے وہ مضامین جو اخبارات و رسائل میں شائع ہوچکے ہیں ان کی تعداد تین سو کے قریب ہے۔ اس طرح ان کی زود نویسی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ان کی عوام اور خواص میں مقبولیت کی وجہ سے کئی مقامی اور بین الاقوامی چینلوں نے ان کے انٹرویو لیے، اور اپنے اپنے چینلوں پر نشر کیے، ریڈیو پر ان کی کی گئی 130 تقاریر نشر ہوچکی ہے۔ یہ ان کی مستقل محنت اور عزم مسلسل کی ایک جھلک ہے، وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ نہایت مخلص اور معزز انسان ہیں۔ اگر ان کی تعلیمی لیاقت کی بات کی جائے تو ان کے پاس ان کی صلاحیت کے اظہار کے لیے ایم، ایس، سی، ایم، ایڈ، بی، جے، ایم، ایم، سی، جے (جرنلزم) پی، جی، ڈی، اے، پی، ایچ، ڈی، (نباتیات) کی اعلیٰ سند موجود ہے، اس وقت وہ ۲۹؍سال سے مولانا آزاد کالج، اورنگ آباد، مہاراشٹر کے شعبۂ نباتیات میں اسسٹنٹ پروفیسر اور ریسرچ گائیڈ ہیں۔ اور کئی یونیورسیٹیوں کے مسلمہ پی ایچ، ڈی ریسرچ کے گائیڈ ہیں۔ دو طلبہ نے ان کی رہنمائی میں PHD حاصل کی۔ انھوں نے

۱۸ر ممالک کا سفر کر کے اپنے تحقیقی مقالے پیش کیے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ناصر قاہرہ یونیورسیٹی کے PHD ریفری ووزیٹنگ پروفیسر ہیں۔

ان کی اعلیٰ تعلیمی کارکردگی اور سائنسی خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند نے ''برائے تدریسی خدمات'' قومی اعزاز نیشنل ایوارڈ دیا، اس طرح وہ ''قومی اعزاز یافتہ معلم'' کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ ان کی کتابوں پر مہاراشٹر، مغربی بنگال اور یوپی اردو اکیڈمیوں نے مختلف انعامات وایوارڈ سے نوازا ہے۔ انھیں ۲۰۰۶ء میں بین الاقوامی بیربل ساوتری اعزاز برائے ریسرچ ان ایتھوباٹنی ملا۔ اور ۲۰۱۲ء میں انٹرنیشنل کانگریس آف ایتھنو باٹنی فرانس کا ''ہائی کوالٹی ریسرچ ایوارڈ حاصل کیا۔ بہترین تحقیق پر ۲۰۱۴ء میں بھوٹان میں انعام حاصل کیا۔

دوسرے ممالک نے بھی انھیں اپنے جامعات میں لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا، ۲۰۱۰ء۔ ۲۰۱۳ء۔ اور ۲۰۱۵ء میں حکومت ایران کی دعوت پر ایران کا سفر کیا، اس کے علاوہ فرانس، بیلجیم، نیدرلینڈ، اسپین، سری لنکا، تھائی لینڈ، ملیشیا، سنگاپور، بھوٹان، سعودی عرب اور نیپال وغیرہ ممالک کا دورہ کر کے اپنے تحقیقی مقالات پیش کیے۔

ڈاکٹر رفیع الدین ناصر کا خصوصی موضوع ماحولیات ہے، ابھی ان کی بہن محترمہ سیدہ فاطمہ زہرا، سابقہ پرنسپل ڈاکٹر ذاکر حسین کالج اورنگ آباد اور ڈاکٹر رفیع الدین ناصر کی مشترکہ سائنسی کتاب؛ جو قومی کونسل کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے، اس کا نام سائنسی قوس وقزح ہے، جس میں دونوں حضرات کے سائنسی مضامین شامل ہیں۔ یہ کتاب ابھی ۲۰۱۹ء میں شائع ہوئی ہے۔ جس میں ''چندریان سے لے کر ویٹیلا، اردو صحافت اور سائنس، زمینی تپش، بایوٹیک فصلیں، ایبولا وائرس، روبوٹ کی مدد سے خیالات پر قابو، اور جدید ٹیکنالوجی اور اردو'' کے حوالے سے مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ مشہور سائنس نگار محترم عبدالودود انصاری نے لکھا ہے کہ ''اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مشکل سے مشکل مضامین بھی سادہ اور سلیس زبان میں اس طرح لکھے گئے ہیں کہ ایک بار پڑھتے ہی قاری کے دلوں میں اتر کر معلومات میں اضافہ کرتی ہے، جو مصنفین کی قابلیت اور اردو پر گرفت کی دلیل ہے۔ (سائنسی قوس قزح، ص ۶)

ڈاکٹر رفیع الدین ناصر کی پیدائش مہاراشٹر کے ضلع بیڑ میں ۱۰ر اکتوبر ۱۹۶۵ء کو ہوئی۔ مشہور تصانیف میں سائنسی ردا، فضائی آلودگی، اسلام اور سائنس، متوازن غذا ہے جب کہ انھوں نے بارہویں جماعت کے لیے اردو اور انگریزی میں ماحولیات سے متعلق کئی نصابی کتابیں اور معاون کتابیں بھی تیار کی ہیں، جن میں ''رہبر حیات برائے بارہویں جماعت، تجربات حیات برائے بارہویں جماعت، علم حیاتیات برائے گیارہویں جماعت، علم حیات برائے بارہویں جماعت، تجربات حیاتیات برائے گیارہویں جماعت، تجربات حیاتیات برائے بارہویں جماعت، ماحولی تعلیم برائے گیارہویں جماعت، حیاتیات برائے گیارہویں جماعت، حیاتیات برائے بارہویں جماعت، ماحولی تعلیم برائے بارہویں جماعت، ودیگر اس سلسلے کی کتابیں انھوں نے تصنیف کیں۔ جو تیس تک پہنچتی ہیں۔

ڈاکٹر رفیع الدین ناصر صاحب نباتیات اور ماحولیات میں متخصص ہیں، اس موضوع پر ان کی کتابوں کا تذکرہ بالا میں ہو چکا ہے، ان کا ایک مضمون؛ جو سائنسی قوس و قزح میں شامل ہے، وہ ''ماحول اور موسمی تبدیلی'' کے عنوان سے ہے، اس میں سے ایک اقتباس قارئین کی ضیافت میں بطور نمونہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے اولاً موضوع کا تعارف کرایا ہے، اور تحریر کیا ہے:

''دور حاضر میں دنیائے انسانیت دو اہم مسائل سے دوچار ہے، ایک ہے ماحول کی بڑھتی ہوئی آلودگی، اور دوسرا

ہے کرۂ ارض پر حرارت میں غیر متوقع اضافہ؛ جسے Global Warming کہا جاتا ہے، ۱۹۹۴ء کی اقوام متحدہ کی رپورٹ میں WHO ورلڈ ہیلتھ آرگنائیزیشن کے مطابق دنیا کے سات شہروں میں سے پانچ شہر ایشیا کے ہیں، جہاں سب سے زیادہ آلودگی پائی جاتی ہے، ان شہروں میں کولکاتا، ممبئی، دہلی، بیجنگ، اور جکارتا شامل ہیں، دہلی اور ممبئی ان شہروں میں سے ہیں جہاں سب سے زیادہ آلودگی پائی جاتی ہے، بعد میں ۲۰۰۰ء کی رپورٹ میں چنئی کو بھی شامل کیا گیا ہے، تازہ ترین رپورٹ کے مطابق دہلی کی بڑھتی ہوئی آبادی اور ذرائع نقل وحمل میں روز افزوں اضافے نے اس شہر کی فضا کو تشویش ناک حد تک آلودہ کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ جس کی وجہ سے بیجنگ، قاہرہ، اور میکسیکو جیسے آلودہ گرین دارالحکومتوں کی صف میں کھڑا کردیا ہے، ہوا میں شامل گرد وغبار، باریک ذرات؛ جن کی پیائش مائکرومیٹر میں کی جاتی ہے، ہوا میں دس مائکرومیٹر سے کم سائز کے پی ایم ۱۰ کہلانے والے ذرات انسانی صحت کے لیے انتہائی خطرناک ہیں۔ یہ انتہائی باریک ترین ذرات انسانی پھیپھڑوں میں پہنچ جاتے ہیں اور پھر وہاں مستقل طور پر جم جاتے ہیں، اس سے ہر سال لاکھوں کی تعداد میں اموات واقع ہوتی ہیں۔ اس عالمی ادارے نے ہوا میں ان ذرات کی زیادہ سے زیادہ مقدار میں بیس ذرات فی مکعب میٹر کی قانونی حد مقرر کی تھی، جب کہ اس شہر میں تین سو ذرات فی مکعب میٹر ناپے جاتے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ہمارا ماحول کس حد تک متاثر ہے۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے ماحول کی تعریف، اس کی اقسام، اور ماحول کے اجزائے ترکیبی، اس کی تعریف، ماحول اور انسانی زندگی، پھر ماحولیات کے موسم پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ نیز اس کے ذمہ دار کون ہیں؟ وغیرہ کا مفصل ذکر کیا ہے، الغرض ان کا ہر مقالہ لائق مطالعہ، مفید اور از حد معلوماتی ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب ماشاء اللہ باحیات ہیں، اور مولانا آزاد کالج اورنگ آباد کے شعبۂ نباتیات کے اسسٹنٹ پروفیسر ہیں اور اسی شہر میں قیام پذیر بھی ہیں، وسعت ظرفی اور کشادہ قلبی کے باعث طلبہ کے بہترین رہنما، اساتذہ کے رفیق، مصنفین کے رہنما اور معین ہونے کے ساتھ بہترین ملنسار اور خوش اخلاق انسان ہیں، ان کا موبائل نمبر 9422211634 ہے۔

شاہ نواز ہاشمی۔ حیدرآباد دکن

غزل

میں اپنا گھر بسانا چاہتا ہوں
تمہیں اپنا بنانا چاہتا ہوں

میں لے کر کیا کروں جنت کی حوریں
تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں

وفا کا پیار کا الفت کا دریا
میں دنیا میں بہانا چاہتا ہوں

تعلق ہے مرا اَمن واماں سے
تعصب کو مٹانا چاہتاہوں

زمیں کا حال دیکھو کیا ہوا ہے
اسے جنت بنانا چاہتا ہوں

ہمارا ہاشمی اللہ ہے بس
یہی سب کو بتانا چاہتا ہوں

احمد نور عینی۔ ریسرچ اسکالر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

اقبال فہمی

اقبال کی اردو شاعری میں ذکر حسینؓ

حسینؓ نام ہے سفینۂ حق کے اس ناخدا کا جس نے کو ظلم کے گرداب گرہ گیر میں بھی طوفان باد وباراں سے مقابلہ کیا، حسینؓ نام ہے کشت حجاز کے اس دہقاں کا جس نے لالۂ صحرائی کو خونیں قبا پہنائی، حسینؓ نام ہے قافلۂ سخت جاں کے اس میر کارواں کا جس کی آبلہ پائی کے نقوش نے منزل حق کا پتہ دیا، حسینؓ نام ہے خم خانہ اسلام کے اس پیر مغاں کا جس نے تہی جام مے خواروں کا پیمانہ بادہ شہادت سے لبریز کیا، حسینؓ نام ہے اس پاسبان حرم کا جس کی ضرب کلیمی سے سنگ راہ دو نیم ہوئے، حسینؓ نام ہے اس مجاہد جاں باز کا جس نے ظالم سے پنجہ آزمائی کی، حسینؓ نام ہے اس مرد حق پسند کا جس نے باطل نظام کی بنیاد پر تیشے چلائے، حسینؓ نام ہے اس شاہین کا جس نے زاغوں کے نشیمن پر بجلیاں برسائیں، حسینؓ نام ہے اس شیخ حرم کا جس کے خون شہادت سے حرم کی داستان رنگین ہے:

غریب وسادہ ورنگیں ہے داستان حرم
نہایت اس کی حسینؓ ابتدا ہے اسماعیلؑ

اقبال نے اس شعر میں دین اسلام کا خلاصہ پیش کر دیا کہ اسلام کی ابتدا بھی قربانی ہے اور انتہا بھی قربانی، اسلام نام ہے خدا کی رضا کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دینے کا، خدا کے حکم کے آگے نفس کو بھی جھکایا جائے گا اور باطل طاقتوں کو بھی سرنگوں کیا جائے گا، حرم کی یہ داستان عجیب وغریب ہے، یہ سادہ بھی ہے اور رنگین بھی، رنگین اس لیے ہے کہ یہ شہادت وقربانی کی داستان ہے، سادہ اس لیے ہے کہ یہ نفسانی خواہشات اور دنیوی تعیشات سے نا آشنا ہے، اس داستان کا آغاز حضرت اسماعیلؑ کے جذبۂ قربانی سے ہوتا ہے اور اختتام حضرت حسینؓ کی شہادت پر ہوتا ہے۔ حرم کے پاسبان اگر نفسانی خواہشات کو قربان کرنے سے گریزاں ہیں اور ان کے دلوں میں جام شہادت نوش کرنے کے مقدس جذبات انگڑائیاں نہیں لیتے تو پھر اس کا مطلب یہ کہ ان کا قبلہ حرم نہیں بل کہ خواہشات کا صنم ہے، انھیں اپنا قبلہ درست کر لینا چاہیے؛ کیوں کہ حرم انھی لوگوں کا قبلہ ہے جن کی ابتدا اسماعیلؑ کا جذبۂ قربانی اور انتہا حسینؓ کا جام شہادت ہو۔

حضرت حسینؓ کے اسوہ پر عمل کر کے اپنی جان قربان کرنے والا حیات جاوداں سے سرفراز ہوتا ہے اور تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جاتا ہے، اقبال کہتے ہیں:

حقیقت ابدی ہے مقام شبیری
بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی وشامی

حضرت حسینؓ کا باطل کے آگے سر نہ جھکا کر حق کے لیے جان قربان کر دینا ایسی جاودانی وابدی حقیقت ہے جو ہمیشہ یاد رکھی جائے گی اور ہر دور میں تسلیم کی جائے گی، حضرت حسینؓ کو شہید کرنے والے شامی حکمران اور حضرت حسینؓ سے بے وفائی کرنے والے کوفی باشندگان ملامت کے نشان اور ماضی کی داستان بن گئے مگر حضرت حسین امر ہو گئے۔ کوفی وشامی کا دغابازانہ اور ظالمانہ کردار ادا کرنے والے ستم ساز ودغاباز ہر زمانے میں سر اٹھاتے ہیں، ان کا سر جھکانے اور ان کا گھمنڈ توڑنے کے لیے ہمیشہ ایک حسینؓ کی ضرورت پڑتی ہے۔ آج کے اس دور میں بھی ہر طرف باطل طاقتیں حق کو کچلنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہیں، ظالم دندناتے پھر رہے ہیں، باطل نظام ہائے حیات نافذ کیے جا چکے

ہیں، اجتماعی زندگی میں اسلامی تعلیمات اجنبیت کا شکار ہو چکی ہیں، ملوکیت کے آثار جنوں اپنی انتہا کو پہنچ چکے ہیں، جمہوریت کا چہرہ روشن تو ہے مگر اندروں چنگیز سے تاریک تر ہے، قومیت کے فتنے نے امت کو تصورِ امت سے بیگانہ کر دیا ہے، خلافت کے خاتمے نے عالم اسلام کو مرکزیت سے محروم کر دیا ہے، جس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے آج وہ قوم خوف و دہشت کی علامت بن چکی ہے، لڑکیاں آج بھی اپنی عزت کی حفاظت کے لیے آواز لگاتی ہیں مگر بحرِ عرب میں کوئی تلاطم برپا نہیں ہوتا، ایسے حالات کا رخ بدلنے کے لیے، تاریخ کا دھارا موڑنے کے لیے، اسلامی نظام حکومت کے نفاذ کے لیے، باطل کے دامان وگریباں کا فاصلہ ختم کرنے کے لیے، ظالم طاقتوں کا پنجۂ خونیں موڑنے کے لیے، قومیت کا بت توڑنے کے لیے اور حق کی خاطر اپنی جان قربان کرنے کے لیے آج بھی ایک حسین کی ضرورت ہے، مگر:

قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ وفرات

دجلہ ہو یا فرات، نیل ہو یا دنیوب، گنگا ہو یا جمنا سب کی موجیں مسلمانوں کے سفینۂ حیات سے اٹھکھیلیاں کھیل رہی ہیں، اب بھی سب کے گیسو آبدار و تابدار ہیں، سب کے گرداب پیچ دار و گرہ دار ہیں، ریگِ عراق و شام حسینؓ کی منتظر ہے، ایک ایسے حسینؓ کی جس کی زبان پر مصلحت پسندی کے چھالے نہ ہوں، جس کے لبوں پر مفاد پرستی کے تالے نہ ہوں، جس کا دل دنیائے دوں کا اسیر نہ ہو، جس کو خوف باطل دامن گیر نہ ہو، ایک ایسے حسینؓ کی جس کے دل میں شہادت کی تمنائیں چٹکیاں لیتی ہوں، جس کا دامن استغنا کی دولت سے مالا مال ہو، جس کی آنکھوں میں باطل نظام کانٹے کی طرح چبھتا ہو، جو عزم و حوصلے کا پیکر ہو، جو کلمۂ حق عند سلطان جائر کو اپنی زندگی کا مشن سمجھتا ہو، جو غلبۂ حق کا خواب اپنی پلکوں پر سجاتا ہو اور رزم گاہ حق و باطل میں اس خواب کی تعبیر ڈھونڈتا ہو، آج حجاز کا قافلہ ایسے حسینؓ سے خالی ہے۔ اس قافلہ کا یہ حال ہے کہ غبار کارواں سے بھی خوف کھانے لگتا ہے، سنگ گراں کو دو نیم کرنے کے بجائے اس سے اپنا سر ٹکراتا ہے، ریگستان کے طوفان سے بچنے کے لیے ریت میں ہی اپنا سر چھپاتا ہے، یہ قافلہ جذبۂ شہادت سے خالی ہے، اس کے دل میں ایمان کی انگیٹھی اتنی سرد ہو چکی کہ شوق شہادت کی چنگاری اپنے وجود کا احساس دلانے سے قاصر ہے، ضرورت ہے کہ قافلہ حجاز کو عشق سرمدی کا جام پلایا جائے؛ کیوں کہ عشق جب پختہ ہوگا تو صدق خلیلؑ بھی ہوگا اور صبر حسینؓ بھی اور باطل کی سرکوبی کے لیے بدر و حنین بھی:

صدق خلیلؑ بھی ہے عشق، صبر حسینؓ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

قافلۂ حجاز اس حسینؓ کا منتظر ہے جس کا دل بے نیاز ہر دو جہاں سے غنی ہو، جو فقر کی دولت سے مالا مال ہو۔ کونسا فقر؟ وہ فقر نہیں جو کاسہ تھماتا ہے، وہ فقر نہیں جو دریوزہ گری سکھاتا ہے، وہ فقر نہیں جو باطل سے سمجھوتے کراتا ہے، وہ فقر نہیں جو زبان حق تراشتا ہے، وہ فقر نہیں جو ظالموں کا دست نگر بناتا ہے، وہ فقر نہیں جو وقت قیام سجدے میں گراتا ہے، بل کہ یہ وہ فقر شبیری ہے جو استغنا کی دولت عطا کرتا ہے، جو خدا کے سوا سب سے بے نیاز کرتا ہے، جو باطل طاقتوں سے بے خوف کرتا ہے، جو فرعونوں کی ناک رگڑواتا ہے، جو ظالموں کو ناکوں چنے چبواتا ہے، جو جام جمشید انڈیلتا ہے اور تاج سکندری سے کھیلتا ہے، جو قیصر و کسری کی بخیہ ادھیڑتا ہے، یہ وہ فقر ہے جو 'من المؤمنین رجال صدقوا ما عاهدوا الله علیه' (احزاب: ۲۲) (ایمان والوں میں سے کچھ لوگ وہ ہے جنھوں نے اللہ کے ساتھ کیے ہوئے وعدے کو سچ کر دکھایا) کے زمرے میں شریک کرتا ہے، یہ وہ فقر و استغنا ہے جو اس آیت کی عملی تفسیر کراتا ہے: 'الذین قال لهم الناس ان الناس قد جمعوا لکم فاخشوهم فزادوهم ایمانا، وقالوا حسبنا الله ونعم الوکیل' (آل عمران: ۱۷۳) (یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان سے لوگوں نے کہا کہ کفار تمہارے مقابلے میں اکٹھے

ہوگئے ہیں؛ اس لیے تم ان سے ڈر کر رہو، تو اس بات نے ان کے ایمان میں اضافہ کردیا اور ان لوگوں نے کہا ہمارے لیے اللہ ہی کافی ہیں اور وہی بہترین کارساز ہیں)، یہی فقر صحابہ کا ہتھیار تھا، اور صحابہ نے اس فقر کو اپنا کر وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل لگائی، روم وایراں کی بساط لپیٹ دی ، یہ فقر جب ہاتھ آتا ہے تو قیادت وسیادت کی باگ کا سرا بھی ہاتھ لگتا ہے، میری وسلطانی کا راز اسی فقر میں پنہاں ہے:

اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری
میراث مسلمانی سرمایۂ شبیری

فقر وعشق، جرات وعزیمت، نظام حق کے نفاذ کی جہد پیہم، وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل اور دل میں انگڑائی لیتا شوق شہادت یہی حضرت حسین کا سرمایہ ہے جو امت اسلامیہ کی حقیقی میراث ہے۔ اس سرمایۂ شبیری کی حفاظت خلوت کدوں میں محصور رہ کر نہیں کی جاسکتی اس لیے اقبال کہتے ہیں:

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری
کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ و دل گیری

فردین نامہ

ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی۔کلکتہ

اخلاص و حلم کے ہیں پیکر فردین
شادابیِ گل زارِ تمنا فردین

ادراک و عرفان کے محور فردین
مواج سمندر میں جزیرہ فردین

اردو کے جانباز سپاہی ہیں آپ
کھل جاتی ہیں کلیاں دل پژمردہ کی

دریائے صحافت کے شناور فردین
ہیں باد بہاری کا وہ جھونکا فردین

تفسیر محبت کا خزینہ فردین
آئینہ کردار ہیں بھائی فردین

تصویر متانت کا نگینہ فردین
ہر ایک کے غمخوار ہیں بھائی فردین

قندیل روایت ہے فروزاں ہر سو
آداب صحافت ہیں جن سے قائم

تحریر صحافت کا قرینہ فردین
وہ سچے قلم کار ہیں بھائی فردین

ایوان صحافت میں فروزاں فردین
تمثیل شرافت ہیں کہ مختار احمد

توقیر نظامت میں درخشاں فردین
تجلیل متانت ہیں کہ مختار احمد

کیں فہم وفراست کی شمعیں روشن
قندیل ذکاوت ہیں کہ مختار احمد

ہیں راہ ادب میں درِّ امکاں فردین
تفصیل صحافت ہیں کہ مختار احمد

پروردۂ تہذیب وفا ہیں فردین
صفحات جسارت پہ ہے فردین کا نام

شائستہ ارباب صفا ہیں فردین
مینار قیادت پہ ہے فردین کا نام

بیباک و بیدار قلم ہے ان کا
اخبار جہاں میں ہیں نمایاں ہرروز

ہر ظلم وتشدد سے خفا ہیں فردین
لب ہائے صحافت پہ ہے فردین کا نام

اخلاص کے ہونٹوں کی دمک ہیں فردین
شاداب خیالات ہیں مختار احمد

احساس کے پھولوں کی مہک ہیں فردین
تابندہ روایات ہیں مختار احمد

محفوظ ہوئی ان سے قلم کی حرمت
سرشارِ دل و دیدہ ہیں ان کی تحریر

ادراک کی آنکھوں کی چمک ہیں فردین
بنگال کی سوغات ہیں مختار احمد

محمد عامل بدایونی۔ ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

ککرالہ میں نعت گوئی کی روایت

روہیل کھنڈ کا تاریخی شہر اور ہندوستان کی قدیم ریاست 'بدایوں' جسے کسی زمانے میں "ویدامؤ" کہا گیا، جس کا مطلب ہے کہ ایسی جگہ جہاں ویدوں کی تعلیم دی جائے۔ سلطان التمش کے دورِ حکومت میں جسے "قبلۃ اسلام" کہا گیا اور عہد جدید میں "مدینۃ العلماء" کہا گیا، جس کا مطلب ہے کہ علماء کا شہر یعنی وہ جگہ جو علم و ادب کا مرکز ہو۔ ایسے اہم اور زرخیز علاقے سے ۱۴ کلومیٹر کے فاصلے پر جانب جنوب ایک قصبہ 'ککرالہ' ہے، جو اپنی زبان، تہذیب اور ثقافت کی بنیاد پر اپنے گرد و نواح کے قصبات اور علاقوں سے منفرد اور ممتاز ہے۔ یہ قصبہ مغربی اتر پردیش میں اپنی ایک شناخت بھی قائم کر چکا ہے۔ ملک کے مختلف صوبوں اور بیرون ملک میں یہاں کے طالب علم تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور کئی اساتذہ اپنی خدمات بھی انجام دے رہے ہیں۔ یہ قصبہ مغربی اتر پردیس میں اس لیے بھی مشہور ہے کہ یہاں کی زبان بے حد دلچسپ اور اہم ہے۔ یہ زبان ہندوستان کی کئی بولیوں کا بے مثال جوڑ ہے۔ اس قصبے نے جنگ آزادی میں اپنی بے پناہ قربانیاں دی ہیں، جو "معرکۂ ککرالہ" کے نام سے درجنوں کتابوں میں سنہرے لفظوں سے لکھا ہوا ہے۔ اس قصبے کو لوگوں نے جنگ عظیم اول میں شرکت کی اور اپنی بہادری کا پرچم ہندوستان سے باہر بھی لہرایا۔ یہ قصبہ اس لیے بھی اہم ہے کہ یہ علم و ادب کا گہوارہ ہے۔ یہاں ایسے شعرائے کرام پیدا ہوئے ہیں، جنھوں نے اپنے زمانے میں کافی مقبولیت حاصل کی اور اردو شعر و ادب میں اپنا ایک الگ مقام بنایا۔ یہاں کے علمی و ادبی ماحول کے بارے میں نظامی بدایونی لکھتے ہیں:

"ککرالہ، ضلع بدایوں کا ایک ممتاز قصبہ ہے، نہ صرف اس وجہ سے کہ اس کی آبادی قصبات میں سب سے زیادہ ہے بلکہ اس قصبہ میں علمی و ادبی ذوق ہمیشہ رہا ہے۔ یہاں ہر نوجوان ابتداء ہی سے شاعرانہ جذبات و خیالات کا حامل ہوتا ہے۔ اس وقت بھی ککرالہ میں میرے متعدد عزیز بھائی موجود ہیں جو مشاعروں میں داد و تحسین حاصل کرتے ہیں۔"

(نظامی بدایونی، تقریظ، راز حیات، مرتبہ شاد ککرالوی، ص ۶)

یوں تو یہاں کا ہر شخص شعر و ادب کا دلدادہ ہے۔ لیکن چند ایسے نام بھی ہیں جنھوں نے نعت گوئی کے فن میں اپنی پہچان بنائی ہے۔

نعت گوئی کا فن اردو شاعری میں بے حد دلچسپ اور بڑا دل کش ہے۔ نعت کے لفظی معنی صفت اور وصف کے ہیں۔ نعت گوئی سے مراد ایسی نظم لی جاتی ہے جس میں حضرت محمد ﷺ کی شان میں اشعار پیش کیے جائیں اور ان اشعار میں آپ ﷺ کے اوصاف کا بیان ہو۔ یعنی اشعار کا وہ مجموع جس میں حضور نبی کریم ﷺ کی تعریف کی جائے اس کو "نعت" کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے جہاں جہاں اپنے محبوب کو یاد کیا دراصل وہاں نعت گوئی کا پیرایہ اختیار کیا ہے۔ نعت گوئی میں شاعر اپنے جذبات، اپنی محبت، عقیدت اور والہانہ پن کا برملا اظہار کرتا ہے۔ نعت گوئی کا موضوع اردو میں بڑا محبوب رہا ہے۔ لیکن پھر بھی اس کی کوئی ہیئت طے نہیں ہو پائی ہے۔ مختلف زمانوں میں مختلف ہیت میں نعتیں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً قصیدے کی ہیئت، غزل اور ترکیب بند کی ہیت وغیرہ۔

اس مقالے کو تحریر کرنے کے پیچھے راقم کا مطمح نظر یہ ہے کہ ان شعرا کو گمنامی سے نکال کر شائقین ادب سے متعارف کرانا ہے اور ان کے نعتیہ کلام کے مطالعے سے روہیل کھنڈ میں نعت گوئی کی روایت کی ایک مضبوط کڑی پر روشنی ڈالنا، جو اب تک دنیائے ادب کی نظر اوجھل تھی۔ اس مختصر مقالے میں ککرالہ کے نعت گو شعرا کا مختصر تعارف مع کلام درج کیا جا رہا ہے۔ یہاں یہ بات بھی عرض کرنا بہتر معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقالہ صرف تحقیقی اور تعارفی نوعیت کا ہے۔ میں اس سلسلے میں برادرم مفتی فہیم احمد ازہری کا بے حد مشکور و ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنے ذاتی کتب خانے سے استفادے کا موقع دیا اور مفید مشوروں سے بھی نوازا۔

فرحتؔ ککرالوی۔ نام غلام محمد خاں فرحت تھا۔ والد کا نام سرفراز خاں تھا۔ محمد بخش فہیم جو منڈھولوی آپ کے شاگرد تھے۔ انھوں نے عربی و فارسی فرحتؔ ککرالوی سے ہی سیکھی۔ آپ بدایوں شہر میں انگریز کلکٹر کے محافظ دستہ پر افسر اعلیٰ تھے۔ آپ نے جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور جنگ آزادی کے اولین مجاہدین میں سے تھے۔ آپ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ چند کتابیں ہی دستیاب ہیں۔ آپ کی ایک کتاب 'فرحت المومنین عزیز المسلمین' ہے، جو مطبوعہ سید المطابع دہلی سے ۱۲۸۷ھ

میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب نایاب ہے۔ آپ کی دوسری کتاب کا نام 'مناجات بسمول اسماء الٰہی' ہے، جو شعری مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ ۲۰۰۲ء میں ان کے خاندان والوں نے شائع کرایا ہے۔ اس مجموعہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ہر شعر میں خدا کا نام اس کی صفات کے مطابق دیا گیا ہے۔ مثلاً یہ اشعار دیکھئے:

بخش یا رحمٰن ہوں میں خوار تر
یارحیمُ مہربانی مجھ پہ کر
یا مجیبُ کر دعا میری قبول
دین دنیا میں نہ کر مجھ کو ملول

آپ کی تیسری کتاب ''نسخۂ آرام چشم'' ہے، جو ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے اس کا قلمی نسخہ راقم کے پاس موجود ہے۔ اس کتاب پر سن تالیف ۱۲۸۸ھ درج ہے۔ یہ فرحت کا شعری مجموعہ ہے۔ نمونہ کلام آپ کی خدمت میں پیش ہے:

رحمتِ حق ہے قریب محسنین
ہے محمد رحمۃ اللعلمین
کیا بیاں ہو تیرا اعلیٰ مرتبہ
قاب و قوسین ایک ادنیٰ مرتبہ
شانِ اقدس ہے سبحان الذی
ہے صفت یٰسین و طٰہٰ میں تیری
بزمِ عظمت میں تیری اے نامدار
خضر و موسیٰ آبدار و چوبدار
حشر میں نفسی کہیں گے سب نبی
تم پکاروگے وہاں پر امتی
یاد رکھنا مجھ کو اے خیرالانام
میں تمھارا جان و دل ہوں غلام

عاجزؔ ککرالوی۔ نام وہاب الدین خاں تھا۔ والد کا نام عبدالغنی خاں تھا۔ ککرالہ میں ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ اردو اسکول میں تعلیم پائی۔ مرادآباد سے نارمل اسکول کا امتحان پاس کیا ہے۔ یہیں شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد محکمۂ تعلیم سے وابستہ ہوگئے۔ ترقی کرکے ہیڈ ماسٹر اسکول ہوئے۔ پھر سب ڈپٹی انسپکٹر اسکول ہوئے۔ جولائی ۱۹۷۷ء میں ککرالہ میں انتقال ہوا۔ ۹۴ سال کی عمر پائی۔ راقم کا خیال ہے کہ آپ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ لیکن صرف دو کتابوں کے نام معلوم ہو پائے۔ ۱۔ تقدیم الزبان اور ۲۔ تقدیم الحساب

۔ پروفیسر ایوب قادری نے تذکرہ بدایوں کے مسودہ میں آپ کا ذکر کیا ہے۔ نمونے کے طور پر صرف تین اشعار ملاحظہ فرمائیں:

یہ راز رکھا تھا شق القمر دکھانے کو
کہ چار چاند لگیں آپ سے زمانے کو
ترا ظہور نبوت تھا اک زمانے کو
کہ زیبِ مُہر نبوت کیا تھا شانے کو
جبینِ سجدہ کی اللہ رے درخشانی
شرف یہ رکھا ہے عاجزؔ کے سر جھکانے کو

آپ نے اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں کی مشہور نعت ''سب سے اولیٰ واعلیٰ ہمارا نبی'' کی تضمین میں نعت لکھی ہے۔ اس نعت میں کل ۱۷ر بند ہیں۔ نمونے کے طور پر صرف دو بند یہاں درج کیے جارہے ہیں:

نور حق کا اجالا ہمارا نبی
قاب قوسین والا ہمارا نبی
دوست حق تعالیٰ ہمارا نبی
سب سے اولاؤ اعلیٰ ہمارا نبی
سب سے بالا و والا ہمارا نبی
جس کو حق نے کیا موجب کائنات
جس نے کی تھی بسر عرش پر ایک رات
جس کے لب میں ہے رازحیات وممات
جس کے تلووں کا دھووَن ہے اک حیات
ہے وہ فخر مسیحا ہمارا نبی

شادؔ ککرالوی۔ نام محمد صالح تھا۔ والد کا نام جناب کلیم الدین تھا۔ اکتوبر ۱۹۲۷ء میں قصبہ ککرالہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ککرالہ ہی میں حاصل کی۔ اس کے بعد فارسی اور عربی میں دسترس حاصل کی۔ بعد ازاں ملازمت اختیار کی۔ تحصیل میں امین تھے۔ ابتداء ہی سے طبیعت شعر وسخن کی طرف مائل تھی۔ مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کرنے کے بعد غزل سے وابستہ ہوگئے۔ پروفیسر ضیا احمد بدایونی نے آپ کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''غزل شاد صاحب کا خاص میدان ہے۔ تقریباً پچاس شعرا آپ سے مشورہ سخن کرتے ہیں۔''

(بحوالہ سید شہید حسین، تذکرہ شعرائے بدایوں، ص ۴۳۹)

شاعری میں جناب ابرؔ گنوری سے شرف تلمذ تھا۔ حضرت

مولانا شاہ عبد القدیر صاحب سے بیعت ہوئے۔شادؔ کی شخصیت بڑی دلآویز، جامع اور متوازن ہے اور نہایت فہیم اور متوازن طبیعت کے شخص تھے۔ان کی شاعری ان کے جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔آپ کا انتقال ۱۹۹۳ء میں ہوا۔ایک مجموعہ ''راز حیات'' ۱۹۵۲ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا۔دوسرا مجموعہ ''ساز حیات'' ہے۔تیسرا مجموعہ ''صہبائے سخن'' ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔چوتھا نعتیہ مجموعہ ''گنجینۂ نعت و مناقب'' ہے، جو ۱۹۸۶ء میں نفیس برقی پریس مرادآباد سے شائع ہوا۔آپ کی شاعری سے متاثر ہوکر مولوی فخرِ عالم لکھتے ہیں:

''جناب شاد قادری ککرالوی کو آقائے نامدار حضرت ختم المرتبت ﷺ سے والہانہ محبت اور عقیدت ہے جو ان کے کلام سے اور اس کے ایک ایک لفظ سے یقینی طور پر ظاہر ہورہی ہے''

(فخرِ عالم، گنجینۂ نعت ومناقب، مرتبہ شاد ککرالوی، ص ۱۶)

شادؔ ککرالوی کے نعت کے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

ہر گزارش پہ وہ کہتے ہیں تمنا کیا ہے
مانگ کچھ اور کہ تو نے ابھی مانگا کیا ہے
شادؔ کو بڑھ کے خود آغوش میں رحمت نے لیا
نسبتِ شاہِ مدینہ ترا کہنا کیا ہے
یہی دو نعمتیں ہیں سب سے بڑھ کر دین دنیا میں
وہاں تکمیل جنت کی یہاں روضہ محمد کا
نگاہِ لطف ذرا شادؔ پر بھی اے آقا
سنا ہے جس نے جو مانگا ملا مدینہ سے
نبی کا نام ہو لب پر مرے دمِ آخر
یہ ایک کام مرے چارہ ساز ہو جائے

جمیل الدین منزلؔ لوہاٹھری نے آپ کی قطعۂ تاریخ وفات کہی ہے۔

بلند اس کا اخلاق بہر طور تھا
کہ ناز اس پہ کرتی رہی شاعری
بہت ہی ہوا ہے ہر اک شخص کو
غم مرگِ امین شاد ککرالوی

۱۹۹۳ء

پیامؔ ککرالوی۔نام شفیع احمد خاں اور تخلص پیامؔ تھا۔والد کا نام جناب محب علی خاں تھا۔یکم جنوری ۱۹۳۰ء کو ککرالہ میں پیدا ہوئے۔ایم۔اے،بی۔ایڈ تک تعلیم حاصل کی اور درس و تدریس کے پیشے وابستہ ہوگئے۔اسلامیہ کالج بدایوں میں لکچرر رہے۔۱۹۴۴ء میں جناب ابرؔ گنوری کے تلامذہ میں شامل ہوئے۔مشاعروں میں کثرت سے شرکت کا شوق رہا اور کافی مقبول رہے۔ککرالہ سے جاکر بدایوں میں جالندھری سرائے میں قیام کیا۔راقم کا خیال ہے کہ ان کا اب تک کلام شائع نہیں ہوا ہے۔ان کے شاگرد خالدؔ ندیم بدایونی ان کے کلام کو یکجا کررہے ہیں۔نعت کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

رہ گزر ان کا قدم ان کا کف پا ان کا
کہکشاں کیا ہے قمر کیا ہے ستارا کیا ہے
میں ثنا خوانِ محمد ہوں مجھے کیا معلوم
غمِ فردا، غمِ دنیا، غمِ عقبیٰ کیا ہے
ایک ٹھوکر نے نکالا مجھے جنت سے پیامؔ
ایک لغزش ہے مرے پاؤں کی دنیا کیا ہے
ہم کیسے گزاریں گے یہ دھوپوں کا زمانہ
زلفوں کی گھٹا ہو کبھی کملی کی گھٹا ہو
اس دل کی پیامؔ اور نہیں کوئی تمنا
وہ درد ملے جس کی مدینہ میں دوا ہو

شہریارؔ۔آپ کا نام شہریار خاں اور تخلص شہریارؔ تھا۔والد کا نام علیم اللہ خاں رہبرؔ۔ککرالہ میں ۱۷؍جولائی ۱۹۳۶ء کو پیدا ہوئے۔پردادا غلام محمد خاں فرحتؔ ککرالوی بھی اپنے وقت کے بڑے شاعر تھے، جن کے حالات مقالے میں درج کیے جاچکے ہیں۔جن کا ذکر تاریخ بدایوں کے تحریک آزادی کے سپاہیوں میں سرفہرست ہے۔وہ بدایوں شہر میں انگریز کلکٹر کے محافظ دستہ پر افسر اعلیٰ تھے۔ککرالہ جنگ آزادی میں آپ کے خاندان نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔جب ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کی تحریک نے زور پکڑا تو اسی سلسلہ میں آپ کے پردادا نے ملازمت سے خیرآباد کہہ دیا۔ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔اس کے بعد اسکول میں داخلہ لے لیا۔آپ کے والد منشی علیم اللہ خاں رہبرؔ ڈسٹرکٹ بورڈ بدایوں کے اسکولوں کے افسر مدرسی کے عہدہ پر فائز تھے۔۱۵؍ستمبر ۱۹۵۸ء کو عہدہ برآ ہوگئے۔رہبرؔ تخلص فرماتے تھے، جو اپنے وقت کے بڑے شاعر تھے۔

اپنے والد صاحب کا شعری رنگ دیکھ کر شہریارؔ بھی شاعری کی طرف راغب ہوگئے اور استاد شاعر عاجزؔ ککرالوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔آپ کے دو مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔نعت کا مجموعہ ''شہریار مدینہ'' ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا اور غزل کا مجموعہ ''شہریار غزل'' کے نام ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔نورؔ

ککرالوی ان کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''جناب شہریار صاحب کی شاعری وہ اثر رکھتی ہے جو کسی بھی سچے عاشقِ رسول کے دل میں درد پیدا کر سکتی ہے اور جس میں سرکار دوعالم ﷺ کی سیرت پاک کی چھلکیاں نظر آتی ہیں۔''

(نور ککرالوی، شہریار مدینہ، مرتبہ شہریار، ص ۱۵)

آپ کے نعتیہ اشعار درج ذیل ہیں:

سب سے اول میں ظہور آپ ہیں پانے والے
مرحبا صلِ علیٰ بعد میں آنے والے
نقش قدم ہیں عرش معلیٰ کی زینتیں
پھر سوچیئے تو کہاں ہوں گے مصطفیٰ کے ہاتھ
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوتا وہاں راز و نیاز
تھا خدا خود سامنے وہ تھے خدا کے سامنے
اک حشر بپا ہوگا کہ دیدارِ نبی ہے
ویسے تو شہریارؔ قیامت نہیں ہوتی
پڑھنے لگوں گا نعتِ شہنشاہِ انبیا
محشر میں آئی بات اگر امتحان کی
جب خدا نے نور کو رکھا بنا کے سامنے
خود ہی عاشق ہو گیا اپنی ادا کے سامنے

اصغرؔ۔ آپ کا نام خواجہ دفعدار خاں تھا۔ پہلے چھیلاؔ بعد میں اصغرؔ تخلص اختیار کیا۔ آپ ککرالہ کے قاضی تھے۔ آپ نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ مثلاً غزل، نظم اور نعت وغیرہ۔ آپ مشاعروں میں کثرت سے شرکت کرتے تھے۔ آپ کی شاعری میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔ اثر آفرینی بھی ہے اور نشتریت بھی۔ جس کا اندازہ ان کے کلام سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ آپ سے منسوب کئی کتابیں ہیں جن کی تحقیق جاری ہے۔ ایک شعری مجموعہ ''سفر حجاز'' ہے، جو ۲۷ر جون ۱۹۷۸ء میں بریلی الیکٹرک پریس، بریلی سے شائع ہوا۔ مجموعے کی خوبی یہ کہ اس میں حج کی مکمل تفصیل شعری انداز میں بیان کی گئی ہے۔ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۷۵ء میں وہ اپنی اہلیہ، جناب ذاکر علی خان اور ان کے پسر میاں اللہ دین حج پر روانہ ہوئے۔ ۲ر جنوری ۱۹۷۶ء کو ان کو یہ سعادت نصیب ہوئی اور واپس اپنے وطن آئے۔ مجموعے میں چند نعت و مناقب کے بعد حج کی پوری روداد ہمارے سامنے پیش کی گئی ہے۔ اس سے متعلق جناب شاداں بدایونی لکھتے ہیں:

''سفر حجاز میں خواجہ صاحب نے اپنا وہ کلام شائع کیا ہے جو اس مبارک سفر کے دوران انھوں نے عشق رسول میں ڈوب کر کہا ہے .....

اگر ہم خواجہ صاحب کے کلام کو زبان و دستور بیان سے ہٹ کر مغز سخن اور ریشہ ہائے واردات تک پہونچیں تو بلا شبہ کیف و وجدان کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر دکھائی دے گا اور گنجینۂ معانی سے دامن بھرا ہوا ایک نظر آئے گا'' (شاداں بدایونی، سفر حجاز، مرتبہ خواجہ دفعدار، ص:۳)

نمونہ کلام درج ذیل ہے:

ہمارا دل اسیر گیسوئے سرکار عالم ہے
جسینانِ جہاں کی زلفِ عنبر چھوڑے جاتے ہیں
یہ رخ پر ہے جمالِ مصطفیٰ کی کار فرمائی
جو خوبانِ جہاں کا روئے انور چھوڑے جاتے ہیں
بدل خواجہ کی خدمت کا ہے ان پر لطف فرمانا
یہ متنبہ پسر متنبہ دختر چھوڑے جاتے ہیں
مدینہ کی فضا نے یاد فرمایا ہے خواجہ کو
یہ بھارت دیش کا اس وقت منظر چھوڑے جاتے ہیں
کھنچ آئے جس میں شکل مبارک حضور ﷺ کی
جاتا ہوں ساتھ ایسا نگینہ لیے ہوئے
جاتا ہے خواجہ روضۂ انور آپ کے
امید و آرزو کا سفینہ لیے ہوئے

فرمانؔ ککرالوی۔ آپ کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں ہو سکی البتہ مفتی فہیم احمد ازہری کی اطلاع کے مطابق آپ کی تاریخ پیدائش ۴ر جنوری ۱۹۴۰ء ہے اور تاریخ وفات ۱۴ر مارچ ۱۹۹۰ء ہے۔ آپ نعت کے بہترین اور قادر الکلام شاعر تھے۔ قصبے کی محفل میلاد میں اکثر آپ ہی کی نعت پاک کو بڑے ہی ذوق و شوق سے پڑھا جاتا ہے۔

نمونہ کلام دیکھیں:

مسلماں جو بھی ہے شیدا تمہارا یا رسول اللہ
خدا کو بھی وہی لگتا ہے پیارا یا رسول اللہ
مجھے دوزخ کا کیا کھٹکا مجھے جنت کا کیا لالچ
جو شیدائی تمہارا ہوں تمہارا یا رسول اللہ
ہوئیں دم بھر میں اے فرمانؔ اس کی مشکلیں آساں
خلوص دل سے جس نے بھی پکارا یا رسول اللہ

شاہ محمد ثقلین میاںؒ۔ آپ کی پیدائش ۱۳ر مارچ ۱۹۴۷ء بروز جمعرات کو ہوئی۔ آپ کے والد شاہ شجاعت علی میاںؒ اپنے وقت کے صوفی

بزرگ تھے۔۱۴ر سال کی عمر میں آپ کے دادا ٹکرالہ سے بریلی لے آئے۔ جہاں آپ نے اپنے دادا کی نگرانی اور رہنمائی میں تعلیم حاصل کی۔علم تصوف وسلوک اور شریعت وطریقت کی تکمیل وتحصیل کے بعد ۱۷ر سال کی عمر میں ۱۹۶۴ء میں بعد نماز جمعہ مریدین وعوام کی موجودگی میں خلافت واجازت سے مشرف فرمایا۔اپنے پیر ومرشد کے وصال کے بعد ۱۹۶۹ء میں مسند سجادگی پر رونق افروز ہوئے۔اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا ذکر ہمیشہ کرتے رہتے۔کبھی نثر میں اور کبھی اس کا اظہار شاعری میں کرتے ہیں۔آپ کا نعتیہ کلام عوام وخواص میں کافی مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کرم کس پر مرے سرکار فرمایا نہیں کرتے
بقدرِ ظرف سائل ان سے کیا پایا نہیں کرتے
کہاں جلوہ محمد کا کہاں تاب نظر اپنی
دل بے تاب پاؤں اپنے پھیلایا نہیں کرتے
اللہ اللہ شانِ قناعت جَو کی روٹی ہی کو کھا لیا ہے
بانٹ کر نعمتیں دو جہاں کی آپ خود صبر فرما لیا ہے
چاند کو کر دیا ہے دو ٹکڑے ڈوبے سورج کو پلٹا لیا ہے
کلمۂ طیبہ مصطفیٰ نے پتھروں سے بھی پڑھوا لیا ہے

نورؔ ٹکرالوی۔نام منتخب احمد خاں اور تخلص نورؔ ہے۔والد کا نام حضرت شاہ شجاعت علی میاںؒ ہے۔ٹکرالہ میں ۱۹۵۵ء میں پیدا ہوئے۔زراعت کو پیشہ کے طور پر اختیار کیا۔۱۹۴۶ء میں ٹکرالہ میں ایک مدرسہ جامعہ بشیریہ کا قیام عمل میں آیا،جسے ان کے جد امجد حضرت شاہ مولانا شرافت علی میاںؒ نے اپنے پیر و مرشد کے نام نامی اسم گرامی سے منسوب فرمایا۔نورؔ ٹکرالوی نے ابتدائی تعلیم اسی مدرسے میں حاصل کی اور مدرسے کے ماحول کو جلا بخشی۔آپ کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔''ترانے ۱۹۸۳ء میں ''ماں کا آنچل'' ۲۰۰۵ء میں اور غزلیات کا مجموعہ ''چراغ پلکوں پر'' ۲۰۱۶ء میں ہو چکے ہیں۔ایک نعتیہ مجموعہ ''اسریٰ کا مسافر'' ۲۰۱۶ء میں شائع ہوا۔آپ بہترین لب ولہجہ کے مالک ہیں۔اپنا منفرد اور خاص انداز رکھتے ہیں۔۔بہترین الفاظ کا بہترین استعمال آپ کی شاعری کی خوبی ہے۔صوبے اور صوبے سے باہر آپ کے کئی شاگرد موجود ہیں۔کلام کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

دیکھ لے سیرت رسول اللہ کی
لے وضو کر کے اٹھا قرآن پاک
حکم جب شاہِ دو عالم نے دیا
کنکروں نے بھی پڑھا قرآن پاک
پیام آئے مسلسل حکایتیں آئیں
وہ آئے بعد میں پہلے بشارتیں آئیں
قلم لرز کے یہ کہتا ہے کیا لکھوں ان کو
کہ جس کی شان میں قرآں کی آیتیں آئیں
نبی کے سبز گنبد سے حسین منظر نہیں کوئی
نبی کے سبز گنبد پر نظارے ختم ہوتے ہیں
اے کاش کہ نورؔ آپ کے دربار میں پہنچے
حاضر کرے ارمانوں کا گلدان خصوصی

راغبؔ ٹکرالوی۔راغب ۲۲ر دسمبر ۱۹۵۵ء میں ٹکرالہ کے ایک زمیندار خاندان میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد جناب حشمت علی پیکاںؔ فنِ موسیقی کے ماہر اور علم وادب کے دلدادہ تھے۔آپ کے والد کا شمار ٹکرالہ کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔آپ کے چھوٹے بھائی مرحوم ثاقب علی بھی موسیقی کے ماہر تھے۔چنانچہ گھر کا ماحول شعروشاعری سے بھرپور تھا،جس کا اثر راغبؔ کی زندگی پر بھی پڑا اور شاعری کا شوق پیدا ہوا اور گاہے بگاہے شاعری کرنے لگے۔جناب راغبؔ بھی خود اچھے گلوکار تھے۔اس لیے کلاسیکی شعرا کے کلام کو یاد کر کے گنگناتے رہتے تھے،جس سے ان کی شاعری کو ایک نئی جہت ملی۔ان کے والد صاحب نے وصال الدین وصالؔ سے ملاقات کروائی اور آپ کو ان کے سپرد کر دیا۔لیکن خدا کو یہ منظور نہ تھا اور جلد ہی جناب وصلؔ کا انتقال ہو گیا۔آپ نے بعد میں جناب منتخب نورؔ ٹکرالوی کی شاگردی اختیار کی۔آپ کا ایک نعتیہ مجموعہ ''تڑپ'' ۲۰۰۸ء میں شائع ہو چکا ہے۔آپ علم عروض کے ماہر ہیں۔آپ کی شاعری میں فصاحت بھی ہے اور بلاغت بھی۔پروفیسر ارتضیٰ کریم آپ کے متعلق لکھتے ہیں:

''انھیں شعروادب کا ذوق اور شوق وراثت میں ملا ہے جسے انھوں نے ایک لائق اور فائق وارث کی مانند نہ صرف سنبھال کر رکھا بلکہ اس میں اضافے بھی کیے ہیں۔۔راغب کی شاعری فکری اعتبار سے قاری کو متاثر بھی کرتی ہے اور متحرک بھی،وہ اپنے اشعار کے حوالے سے روشن ذہن اور باخبر شاعر کہے جاسکتے ہیں۔''

چنانچہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

لب نور دہن نور بدن نور قدم نور
بیشک ہیں سراپا مرے سرکار امم نور
بکھری ہے بہر سمت تجلی ہی تجلی

ہر ذرہ مدینے کا ہے اللہ قسم نور
ہاتف کی ندا آئی کہ کونین سجا دو
معراج ہے معراج ہے ملتے ہیں بہم نور
راغبؔ جہاں گیسوئے محمد کا ہوا ذکر
برسانے لگا آکے وہیں ابرِ کرم نور
یہ مرتبہ ،یہ عظمتِ سلطان مدینہ
کرتا ہے خدا مدحتِ سلطان مدینہ
آیت کوئی پڑھ کر اسے قرآں کی سنادو
پوچھے جو کوئی سیرتِ سلطان مدینہ
عرب کے چاند کی ایسی نظر پڑجائے راغبؔ پر
کہ ٹکرالہ سے اس کو گنبدِ خضریٰ نظر آئے

یہاں ان شعرا کا بھی ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں ،جن کا نعتیہ کلام تو حاصل نہیں ہوسکا لیکن ان کا ذکر بدایوں کی مختلف کتابوں میں ضرور ملتا ہے۔جناب اشفاق صاحب (مرحوم) سے جب اس سلسلے میں گفتگو ہوئی تو انھوں نے اس طرف اشارہ کیا کہ یہ شعرا غزل کے ساتھ ساتھ نعت کے بھی شاعر تھے۔لیکن ان کا نعتیہ کلام تو دستیاب نہیں ہوسکا البتہ ان کی حیات وشخصیت سے متعلق چند پہلو ضرور سامنے آئے۔

سوزؔ ٹکرالوی۔نام اشرف حسن خاں،عرفیت حسن سوز تھی۔والد کا نام حاجی مظہر علی خاں تھا۔ٹکرالہ میں پیدا ہوئے لیکن پاکستان بننے کے بعد کراچی چلے گئے۔کراچی میں کچھ روز'' کراچی میونسپل کارپوریشن'' میں ملازمت کی۔اس کے بعد اس سے سبکدوشی حاصل کرلی اور اپنا کاروبار کیا۔کراچی میں کتابوں کی دوکان کی، جو بعد میں ختم ہو گئی۔کچھ دنوں ''اخبار جہاں'' سے وابستہ رہے۔آپ کو ابتدائی عمر ہی سے شاعری کا شوق تھا۔آپ حضرت انجم فوقی بدایونی کے عزیز شاگردوں میں سے تھے۔نہایت سوچ سمجھ کر شعر کہتے تھے۔آپ کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔پہلا مجموعہ ''آب نیساں'' ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا اور دوسرا مجموعہ ''نشیب وفراز'' ۱۹۷۱ء میں طبع ہوکر سامنے آیا۔تذکرہ شعرائے بدایوں کے مؤلف سید شہید حسین شہیدؔ نے آپ کے بارے میں لکھا ہے:

''مشک کو اپنی خوشبو سے خود پہچانا جاتا ہے۔اس کو تعارف کی ضرورت نہیں۔''

(سید شہید حسین،تذکرہ شعرائے بدایوں،ص ۴۳۰)

اثرؔ ٹکرالوی۔نام عبدالرشید اور تخلص اثرؔ تھا۔والد کا نام خورشید خاں تھا۔حکیم انجم فوقی بدایونی (بدایوں کے استاد شاعر) کے شاگرد تھے۔حکیم غلام محمد خاں (جنگ آزادی کے فعال اور متحرک شخص اور ٹکرالہ کے اولین دور کے شاعر) کے لڑکے حکیم لطف اللہ خاں تھے۔حکیم لطف اللہ خاں کے تین بیٹے تھے،جن کے نام حکیم صادق،حکیم عاشق خاں اور حکیم عبدالرشید تھے۔تذکرہ شعرائے بدایوں میں آپ کا ذکر مع ۷/اشعار کے شامل ہے۔اثرؔ کا خاندان ٹکرالہ میں کئی پشتوں سے آباد ہے اور شعروشاعری اعلیٰ ذوق رکھتا ہے۔

پریمؔ ٹکرالوی۔نام ڈاکٹر اوم پرکاش تھا۔تعلیم اردو ہندی مڈل تک حاصل کی۔ہومیوپیتھی سے دلچسپی تھی ،جو باقاعدہ پڑھی تھی اور اسی کو ذریعۂ معاش بھی بنایا۔۱۹۴۶ء میں جناب ابرؔ گنوری کے شاگرد ہوئے۔تذکرہ شعرائے بدایوں میں آپ کا تذکرہ شامل ہے۔

پیکاںؔ۔نام حشمت علی خاں تھا والد کا نام خدا یار خاں تھا۔پیدائش ٹکرالہ میں ۱۹۱۹ء میں ہوئی۔پہلے زمینداری اور بعد میں کاشت کاری کو ذریعۂ معاش بنایا۔جناب وہاب الدین خاں عاجزؔ ٹکرالوی، رٹائرڈ ہیڈ ماسٹر جونیر ہائی اسکول کے شاگرد ہوئے۔آپ کی وفات ۲۰/فروری ۲۰۰۹ء میں ہوئی۔آپ کا ذکر تاریخ گویان بدایوں میں ملتا ہے۔آپ نے اپنی پیدائش خود کہی ہے۔

سولہ جنوری سن سولہ
دنیا میں آئے منھ کھولا
اب چھوٹنے والا ہے پیالہ
سانسیں چلتیں ماشہ تولہ

مذکورہ بالا گفتگو کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا کہ ٹکرالہ ایسا زرخیز علاقہ ہے کہ یہاں کے شعرا نے اردو ادب میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ان شعرا کے نعتیہ کلام سے بخوبی یہ اندازہ لگایا جاسکتا کہ ان کے کلام میں کتنی وسعت اور بالیدگی ہے اور حضور نبی کریم ﷺ سے کس قدر والہانہ محبت ہے؟ جس کا اظہار انھوں نے اپنے کلام کے ذریعے کیا ہے۔ان شعرا کے مطالعے سے روہیل کھنڈ میں نعت گوئی کی سمت ورفتار کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اگر ان شعرا کو مزید تحقیق وتنقید کے مراحل سے گزارا جائے اور موضوع بحث بنایا جائے تو اس سے نئے پہلوؤں پر روشنی پڑے گی اور یہ اردو ادب میں مزید اضافے کا سبب بنیں گے۔ٹکرالہ میں اس وقت بھی کئی شاعر ایسے ہیں جو نعت گوئی میں طبع آزمائی کررہے ہیں۔جن میں محبوب ثقلینی ،ڈاکٹر سہراب،شہریار چاند،آبشار آدم،آغاز ساقی،وسیم نادر،عظمت جیلانی،ڈاکٹر توحید اختر،فرحت نوری،شمس عادل،فرحان خان فرحان اور افضل خان وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر ابراہیم عمری۔ تمل ناڈو

محمد مہدی واصف مدراسی: حیات وخدمات

مہدی واصف کی پیدائش شہر مدراس میں 1217ھ مطابق 1802ء میں ہوئی۔ آپ کا سلسلۂ نسب خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔ آپ حافظ قرآن، عالم وفاضل، قادر الکلام شاعر، اور اپنے وقت کے بہترین مترجم تھے جنھیں عربی، اردو، فارسی کے علاوہ مقامی زبانوں میں تامل، تلگو، کنڑا، ملیالم کے سوا بین الاقوامی زبانوں میں انگریزی اور ترکی سے اچھی واقفیت تھی۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار عارف الدین رونق مدراسی سے حاصل کی، جو کہ علامہ باقر آگاہ ویلوری کے تلامذہ میں سے ہیں۔ علاوہ ازیں مولوی عبدالقادر حسینی سے عربی صرف ونحو، عقائد، فقہ، تفسیر قرآن اور احادیث کی کتابیں پڑھیں۔ نیز آپ نے شیخ محمد عبدالوہاب محدث المخاطب بہ ''مدار الامراء'' سے علم معقول و منقول کی تکمیل کی۔ مہدی سن 1819ء میں سترہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے۔

خدائے عزوجل نے آپ اندر کئی طرح کی وہبی صلاحیتیں ودیعت کی تھیں جن کی بدولت آپ کا شمار معاصرین میں نمایاں طور پر ہوتا ہے۔ مہدی نے اپنی خدمات نو وارد انگریزوں کی تعلیم وتربیت سے شروع کی 1826ء میں وہاں سے وظیفہ حاصل کرلیا۔ بعد ازاں آپ کئی سالوں تک درس وتدریس اور ترجمہ کے کام میں مصروف رہے۔ آپ نے انگریزوں کی قائم کردہ ''فورٹ سینٹ جارج'' کالج میں بطور مترجم اپنی خدمات انجام دیں۔ اسی دوران آپ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی جانب سے فارسی میں ترجمہ کئے گئے دو حدیث کی کتابوں کی اقتباسات کو اردو قالب میں ڈھالا تھا۔ (تاریخ اردو ادب، جلد دوم ص:58 مرتب: سیدہ جعفر، ساہتیہ اکیڈمی، دہلی) جن کا شمار زبان اردو کے ابتدائی حدیث کے تراجم میں ہوتا ہے۔

1846ء میں جب نواب ولاجاہ غلام غوث خاں المتخلص بہ ''نواب اعظم'' نے ''مجلس اعظم'' قائم کی تو مہدی واصف کو آرکاٹ دعوت دی گئی اور بزم سخن کا ''رکن اعلیٰ'' مقرر کیا گیا۔ علاوہ ازیں ترجمہ کے میدان میں آپ کی مہارت تامہ اور ید طولیٰ کی وجہ سے ''محکمہ عالیہ والاجاہی'' میں بطور مترجم آپ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ یہاں پر آپ کا قیام 1854ء تک رہا۔ اس کے بعد آپ نے شہر حیدرآباد کا رخ کیا اور وہیں پر مستقل سکونت پذیر ہوگئے، جہاں آپ نے مدرسہ دار العلوم میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ آپ کی وفات یہیں پر 71 سال کی عمر میں بتاریخ 23 ستمبر 1873ء کو ہوئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جناب سخاوت مرزا صاحب جو آپ کی ایک عربی تصنیف ''حدیقة المرام فی تذکرة العلماء الاعلام'' کے مترجم ہیں، انہوں نے آپ کا مرقع اس طرح پیش کیا ہے ''میانہ قد وقامت، سرخ وسپید رنگ، گھنی داڑھی، متوسط جسم اور گول چہرے کے آدمی تھے'' (حدیقۃ المرام، مترجم ص: 7 مطبوعہ: انجمن ترقی اردو پاکستان طبع اول 1979-82)

انسان جو اس دار فانی میں آتا ہے اس کی یہاں سے رخصتی واجب ہے مگر چند نفوس ایسے ہوتے ہیں جو اپنے بعد بھی اپنے نقوش کے گہرے اثرات چھوڑ جاتے ہیں، مہدی کا شمار

بھی انہیں لوگوں میں ہوتا ہے۔آپ نے تصنیف وتالیف اور ترجمہ کا ایسا مواد اپنے پیچھے چھوڑا ہے کہ یقیناً آنے والی نسلیں آپ کو عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھے گی۔آپ نے مختلف علوم وفنون پر اپنا اشہب قلم اٹھایا ہے، چاہے وہ علوم اسلامیہ ہوں یا ادب ہو کہ لغت اور تاریخ۔مرزا سخاوت نے ابو محمد عمر الیافعی کے حوالے سے آپ کی تصانیف وتالیفات اور ترجموں کی تعداد تقریبا تین سو تک بتائی ہے۔جن میں سے ترپن(53) کی فہرست اپنی کتاب میں شامل کی ہے۔آپ کی یہ رشحات قلم عربی ،فارسی اور اردو زبانوں میں ہے۔آئندہ سطور میں مہدی کی چند کتابوں کا تعارفی تبصرہ ملاحظہ کریں۔

(1)دلیل ساطع 1259ھ): یہ چہار لسانی لغت ہے،جس میں سنسکرت،اردو،ہندی اور فارسی کے الفاظ شامل کئے گئے ہیں۔پاکستان کے مشہور محقق جناب عطش درانی نے اس لغت کو انیسویں صدی کے نمائندہ ابتدائی لغات میں شامل کیا ہے۔

(2)حکایت دلپسند: یہ کتاب فارسی زبان میں لکھی گئی ہے،جس کے اندر مختصر مگر نصیحت آمیز حکایتوں کو جمع کیا گیا ہے۔اس کی PDF فائل ریختہ ڈاٹ کام پر موجود ہے۔

(3)حدیقة المرام فی تذکرة العلماء الاعـــــلام(1279ھ): یہ کتاب عربی زبان میں لکھی گئی ہے،دراصل یہ ان علماء کرام کے تذکرہ کا مجموعہ ہے جو مدراس اور اس کے طراف واکناف کے رہنے والے تھے۔یہ کتاب مذکورہ شخصیات کے حوالے سے سند کی حیثیت رکھتی ہے۔کتاب کی اہمیت کے پیش نظر سخاوت مرزا نے1979ء میں اس کتاب کو اردو قالب میں ڈھالا ہے جسے انجمن ترقی اردو پاکستان نے شائع کیا ہے۔

(4)ترجمہ تفسیر جلالین: یہ تفسیر جلالین کا تحت اللفظ ترجمہ ہے۔(5)ترجمہ کیمیائے سعادت: یہ امام غزالی کی مشہورہ زمانہ کتاب''احیاء العلوم'' کا اردو ترجمہ ہے،جو کہ تصوف اور علم سلوک کے اندر خاص مقام رکھتا ہے۔

(6)تہذیب الاخلاق: اخلاق وعادات حسنہ سے متعلق بزبان عربی تحریر کی گئی کتاب ہے،جو مدراس سے شائع ہوچکی ہے۔(7)ڈکشنری انگریزی: یہ انگریزی لغت ہے جو مطبوعہ ہے۔(8)معدن الجواہر: یہ فارسی کلام اور نثر سے متعلق مواد پر مشتمل کتاب ہے(9) دیوانِ اُردو مسکینؔ(10) تذکرہ شعرائے فارسی(11) لؤلؤ منثور فی آداب القبور (عربی) (12)برزخ نامہ (تصوف)(13)املاء نامہ واصفی (اُردو) (14)وسیلۃ النجات (فارسی) شرح اسماء وصفات مطبوعہ (15)توصیف النبیؐ (اُردو)(16)ترجمہ دارالمختار (قلمی) (17) حسنِ خطاب وردّ جواب (فارسی)(18)حقیقتِ ایمان(تصوف)(19)مطالب القرآن (قلمی،تفسیر) (20)جواہر الفوائد (فارسی، احادیث)(21) الرسالۃ البھیۃ الدافعۃ نسبۃ المرجئۃ الی الحنفیۃ(22)القول المتین(23) فصل الخطاب (24)تاریخ واصف(ترکی، قلمی)(25) مناظر اللغات(فارسی واردو)(26)مجموع الامثال(اردو نثر قلمی)

(بقیہ،ص:۱۱کا)

ہوگا''۔(ایضاص ج)

صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے ایک بہت ہی عمدہ کتاب''ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں'' لکھی ہے اور جو ۱۹۶۶ء میں دارالمصنفین سے شائع ہوئی،اس کے دیباچے کا آغاز علامہ شبلی کے ذکر سے ہوتا ہے،لکھتے ہیں:

''علامہ شبلی نہ صرف امیر خسرو کی شاعری کی جہاں گیری کے بڑے مداح تھے بلکہ ان کی وطنی رواداری اور محبت کو بھی اپنے ایک مقالہ''مسلمانوں کی علمی بے تعصبی میں'' بڑی فراخ دلی سے دکھایا ہے۔اس مضمون میں انھوں نے امیر خسرو کی مثنوی نہ سپہر سے کچھ اشعار بھی نقل کئے ہیں،راقم نے جب ان اشعار کو دیکھا تو خیال ہوا کہ امیر خسرو کے اس قسم کے تمام اشعار ایک جگہ جمع کردیئے جائیں تو ان کی وطنی محبت کی اور بھی زیادہ صحیح تصویر سامنے آجائے گی''۔(ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں ص ا)

ڈاکٹر محسن جلگانوی۔حیدرآباد

اسلم عمادی سے گفتگو

اسلم عمادی کا شمار جدید رجحان کے سرفہرست شاعروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے جدید غزل کو نئی سمت اور رفتار بخشی ۔ داخلی وارداتوں کی ترجمانی کے ذریعہ اسے جدید حسیت سے وابستہ کیا۔ ان کے اسلوب میں نئے شعری پیکر، نئی علامتیں اور ایمائیت کی موجودگی کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ روزنامہ اعتماد کے دفتر میں اُن سے ایک مصاحبہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ گفتگو کافی طویل ہوچکی تھی ۔ اسی مصاحبے سے چند اہم سوالات اور ان کے جواب کچھ ترمیم واضافہ کے ساتھ یہاں قارئین کے لیے پیش ہیں۔

محسن جلگانوی: اسلم صاحب! آپ سے میری کوئی 30 پینتیس برس سے کی رفاقت ہے۔ ہم لوگ حیدرآباد کی ادبی محفلوں اور بالخصوص حیدرآباد لٹریری فورم سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ پھر ادبی جلسوں اور مشاعروں میں بھی ساتھ ساتھ رہے ہیں لیکن آپ سے یہ پوچھنے کی نوبت نہیں آئی کہ آپ کے نام کے ساتھ ''عمادی'' کے لاحقہ کا پس منظر کیا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ کنیت بھی ان لوگوں کی طرح ہے جو اپنے ناموں کے ساتھ زندگی بھر افغانی اور سلطانی وغیرہ لگائے رکھتے ہیں اور بعد تحقیق پتہ چلتا ہے کہ ان کے رشتہ کا کسی افغانی یا سلطانی کے آباءواجداد یا خاندان سے کہیں دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں رہا۔ ممبئی میں ہمارے کرم فرما سینئر دوستوں میں مشاعروں کے بہت کامیاب شاعر اور فلمی نغمہ نگار دوست صبا افغانی ہوا کرتے تھے۔ افغانی، اُن کے تخلص کا لاحقہ تھا لیکن افغانستان سے ان کا کوئی تعلق تھا نہ افغان سے۔ میرے نام کے ساتھ بھی یہ سانحہ ہوا کہ برسہا برس تک جلگاؤں ہی کے لاحقہ کے ساتھ اخباروں، جریدوں اور مشاعروں میں مشہور رہا پھر اچانک ہی چند برسوں کے لیے اپنے استاد محترم سلطان نقشبندی کی مناسبت سے سلطانی کا سابقہ اختیار کرلیا اور محترم سلطان نقشبندی کی مناسبت سے سلطانی کا سابقہ اختیار کرلیا اور محسن جلگانوی کے نام سے لکھتا پڑتا رہا۔ حیدرآباد کے نامور شاعر اور میرے مشفق اور مہربان ناب اوج یعوبی نے ایک ملاقات میں اظہار خیال کہ میرا یہ فیصلہ میری شناخت کو دس پندرہ سال پیچھے لے جائے گا۔ میں نے اس بات پر غور کیا اور اپنے پہلے نام کی ڈگر پر لوٹ آیا۔ ویسے طالب رزاقی صاحب کے نام بدلے کے واقعہ سے تو آپ واقف ہی ہوں گے۔

اسلم عمادی: (قہقہہ) بہت خوب، آپ نے اپنی کرید کی کیا خوب تمہید باندھی ہے۔ بھائی میرے! میرے ساتھ ایسا کوئی معاملہ نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ شیخ عمادی الصدیق الیمانی جو میرے جدّ امجد تھے وہ مدینہ منورہ سے یمن ہوتے ہوئے تقریباً چھ سو برس پہلے سرزمین ہند پہنچے تھے۔ ان کی ہندوستان میں آمد کا مقصد علوم باطنیہ، منطق اور فقہ کی اشاعت تھا۔ وہ سب سے پہلے اتر پردیش کے شہر جون پور پہنچے اور شیخ طریقت شاہ قطب بنیادل رحمتہ اللہ علیہ کے مشورہ سے موضع امراتو میں سکونت اختیار کی۔ علم ادب اور فن میں ہمارے آباواجداد نے اپنی شناخت بنائی انہی میں ہمارے بزرگ عبداللہ عمادی کی شہرت ومقبولیت پھیلتی رہی۔ حیدرآباد میں جب دارالترجمہ کا قیام عمل میں آیا تو ان کا خاندان حیدرآباد منتقل ہوگیا اور وہ دارالترجمہ میں تقرر پاگئے۔ اس طرح ہمارے خاندان اور میرے نام کے ساتھ عمادی کا لاحقہ منسلک ہے۔

س: کیا آپ کو ادب و شاعری ورثے میں ملی؟

ج: جی نہیں! میرے والد مولوی محمد مسلم عمادی فوج سے منسلک تھے۔ نہ شاعر نہ ادیب لیکن گھر اور خاندان میں شعر وادب کا ماحول ہمیشہ رہا اور بچپن ہی سے شعری وجدان میں گھر بناتا رہا۔ باوزن مصرعے کہہ لینے کی عادت سی ہوگئی تھی۔ کوئی 1962ء میں اس جانب باقاعدہ رغبت ہوئی۔

س: اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ ادب میں کوئی فرد اچھا شاعر ہوتا ہے تو اچھا نثر نگار نہیں ہوتا لیکن آپ اچھے شاعر ہی نہیں اچھے نثر نگار بھی ہیں۔ پہلے آپ کی شاعری کی بات کرتے ہیں۔ یہ بتایئے کہ آپ نے شعری مطالعہ کی ابتداء کہاں سے کی؟ میرا مطلب ہے حیدرآباد کے کسی شاعر کو پڑھ کر یا متقدین میں سے مومن، غالب، میر یا ذوق پڑھ کر؟

ج: میرے شعر کے ذوق کی ابتداء قدیم شعراء کے کلام کے شب و روز مطالعہ سے ہوئی۔ ''آب حیات'' وہ پہلی کتاب ہے جس نے مجھے راغب کیا پھر دیوان غالب، مومن کا کلام، ظفر کا مجموعہ اور نہ جانے کتنی ہی کتابیں میرے شوق کو مہمیز کرتی رہیں۔

س: آپ ہمیشہ سے خلوت پسند رہے ہیں۔ آپ کے ملنے والے بھی مخصوص ہوا کرتے تھے آج بھی کچھ ایسا ہی، ایسا ایسا کیوں؟

ج: اصل میں مجھے زیادہ بھیڑ بھاڑ اور وقت گذاری پسند نہیں۔ میں کام کرنے اور خود کو مصروف رکھنے پر زیادہ توجہ دینے کا عادی ہوں۔ بھیڑ میں فنکار کی تخلیقی صلاحیتیں ضائع ہوتی ہیں اور وہ گلی کوچوں کی نذر ہوکر مثبت کاموں کے برخلاف منفی سرگرمیوں کا حصہ دار بن جاتا ہے۔

س: جب آپ نے حیدرآباد میں شاعری کی ابتداء کی تھی، کئی کلاسیکی شعراء اور ترقی پسند تحریک سے وابستہ شاعروں کا ایک جم غفیر تھا، ان سے بچ کر آپ نے اپنا پہلا ہی قدم جدید شاعری کی زمین پر کیسے رکھا اور اس شاعری پر جلد ہی گرفت بھی حاصل کرلی، یہ کیسے ہوا؟

ج: میری فطرت میں ابتداء ہی سے بات کو کریدنے اور اس کی تہہ تک جانے کی عادت رہی ہے۔ میں مصنوعی معاملات، موضوعات، ماحول اور مصنوع فضائی کو پسند نہیں کرتا۔ میرے سلسلہ میں ہوا یوں کہ 1963ء میں ڈاکٹر عبدالوحیدی فیروز سنز پبلی کیشنز لاہور کی طبع کردہ ایک کتاب ''تذکرہ جدید شعرائے اردو'' میرے ہاتھ لگ گئی۔ اس میں جدید شعراء ن۔م۔راشد، تصدق حسین خالد، ڈاکٹر تاثیر وغیرہ کی نظمیں پڑھیں تو لگا بند ذہن کی کھڑکیاں کھل گئی ہیں اور بادِ نسیم کے جھونکے روح کو چھو رہے ہیں۔

س: ن۔م۔ راشد کی شاعری کو ادب میں چستانیت آمیز شاعری کا نام دیا جاتا رہا ہے ان کی شاعری کی تفہیم کے کارِ گراں میں غیاث متین اپنا پی ایچ۔ڈی کا مقالہ نہیں لکھ سکے اور تجزیہ کے سراب میں گم ہوگئے۔ آپ اس مرحلہ سے کیسے گذرے کہ آپ نے ن۔م۔راشد، میراجی کی نظموں کے تجزیاتی مطالعہ شروع کیا، کیا یہ اسی مطالعہ کا اثر تھا؟

ج: وہ مضامین فوری نہیں بلکہ بہت بعد میں لکھے گئے تھے۔ میں نے چند ایسے شاعروں کی نظموں کا تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی تھی جن کی شاعری تمام قاری کے لیے ہمیشہ چیستاں بنی رہی مگر سلسلہ زیادہ دن جاری نہیں رہ سکا۔

س: میں پچھلی صدی کی چھٹی ساتویں دہائی کی بات کررہا ہوں۔ آپ اور ہم نئے لکھنے والے تھے حیدرآباد میں نئی پود کے ادیبوں اور شاعروں کا ایک حلقہ ادارہ پیکر سے تعلق رکھتا تھا جس کی سربراہی اعظم راہی کرتے تھے۔ اسی ادارہ سے ماہنامہ پیکر بھی شائع ہوتا تھا جس نے نئے لکھنے والوں کی ذہن سازی کی تھی۔ اس حلقہ سے وابستہ جو لوگ تھے وہ بہت پرجوش اور فعّال تھے۔ اسی تنظیم نے بعد میں حیدرآباد لٹریری فورم کی بنیاد رکھی جس نے حیدرآباد میں جدید رجحان کے پیش رفت میں نمائندگی کی۔ کیا آپ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ اس کا دائرہ

دانستہ یا نادانستہ محدود رکھا گیا اور کئی لوگوں کے ساتھ امتیازی رویہ بھی اپنایا گیا۔ آپ پابندی سے جریدہ پیکر میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ کیا آپ پیکر کے ادارے سے بھی وابستہ رہے ہیں؟

ج: مجھے آپ کی بہت سی باتوں سے اتفاق ہے۔ میں ادارۂ پیکر سے اتنی گہرائی کے ساتھ کبھی وابستہ نہیں رہا۔ ہاں! میری اس سے قلمی معاونت ضرور رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ میں زیادہ تر ملک سے باہر ہی رہا۔ اس لیے شرکت فاصلاتی ہی رہی۔

س: اس مرحلہ پر مجھے یاد آیا ان دنوں آپ نے ''پیکر'' کے لیے حیدرآباد میں اردو کی نئی شاعری کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں 1960ء سے 1971ء تک کے حیدرآباد کے شاعروں کا احاطہ کیا گیا تھا جو تنازعات کا شکار ہو گیا تھا اور بہت سے شاعروں کو اس مضمون سے شکایتیں ہو گئی تھیں۔ اس مضمون میں چند ایسے شاعروں کے نام بھی تھے جن کا نئی شاعری میں کوئی نام اور نہ مقام تھا اور کئی لوگ جو نئی شاعری سے وابستہ تھے ان کا تذکرہ نہ تھا۔ اس بارے میں آپ کچھ کہنا چاہیں گے؟

ج: دیکھیے ہوا یوں تھا کہ 1971ء میں نے ایک مضمون لکھا تھا جو تقریباً ان تمام حیدرآبادی شاعروں کے تذکرے پر مبنی تھا جو 1960 کے بعد فعال رہے۔ مضمون طویل تھا۔ چھپنے کے لیے بہت جگہ مانگتا تھا۔ اس طوالت کے سبب رسائل اس کے متحمل نہیں ہو سکے۔ ''ماہ نامہ پیکر'' کے مدیر اعلیٰ اعظم راہی اور ان کی بزم مشاورت نے اس مضمون کو پسند کیا لیکن اتفاق ان سب کا اس پر تھا کہ صرف انتخاب شائع کیا جائے۔ اس طرح منتخبہ مضمون ''پیکر'' حیدرآباد میں شائع ہوا اور ایک اکائی بن کر ابھرا۔

س: جناب بعد میں پتہ چلا کہ وہ تمام مواد جو حذف کر دیا گیا تھا' وہ آپ نے دوبارہ بحال کر دیا لیکن پھر بھی کئی نام شامل ہونے سے رہ گئے؟

ج: آپ نے صحیح کہا' میں نے مضمون کے حذف کردہ حصّے دوبارہ بحال کر دیئے تھے بہت ممکن ہے اس کے باوجود کچھ نام شامل نہیں ہوئے ہوں اب پورے شہر کو تو اس میں سمویا جانا ممکن نہ تھا!

س: ادبی حلقوں میں اس مضمون کی بڑی پذیرائی ہوئی تھی۔ آپ کی نثری تحریروں کی کتاب ''ادبی گفتگو'' میں یہ مضمون شامل ہے۔ جس میں 31 شاعروں کا تذکرہ شامل ہے ان میں سے تادم تحریر 21 کیس شاعر اس دیار فانی سے رخصت ہو گئے ہیں۔ آج کے دن تک مزید چار پانچ کا اضافہ کر لیں یعنی حلف کے چار پانچ افراد باقی ہیں اور بس۔ آپ بہت اچھے نثر نگار ہیں مختلف جرائد میں آپ کی تحریریں شائع ہوتی ہیں اور دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں کیا موجودہ پس منظر میں آپ پھر ویسا ہی کوئی مضمون لکھنے کی زحمت کریں گے جس سے نئے شاعری کا Up date منظر نامہ اجاگر ہو سکے؟

ج: آپ کی تجویز اچھی ہے' فرصت ملی تو میں اس جانب توجہ کروں گا یا کوئی اور بھی اس منظر نامے کو لکھ سکتا ہے۔ مثلاً آپ.....!

س: اسلم صاحب آپ پچھلے تیس سال سے ملک سے باہر ہیں اور اس دوران آپ نے دنیا کے مختلف ممالک میں خود کو مصروف بہ کار رکھا ہے۔ اس کے علاوہ غالباً یوروپ وغیرہ میں بھی آپ نے مشاعرے پڑھے ہیں۔ ہمارے ملک میں بعض جرائد و اخبارات میں اردو کی نئی بستیوں کی اصطلاح بہت مشہور ہے۔ آپ یہ بتانے کی زحمت کریں کہ ہندو و پاک سے ہٹ کر کیا کہیں اور بھی اردو کی نئی بستیوں کا کوئی وجود ہے؟۔ کیا وہاں اسکولوں' کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے؟ یا صرف عالمی مشاعروں کے انعقاد کے باعث اردو کی نئی بستیوں کا ہوّا قائم ہے؟۔

ج: اردو کی نئی بستیاں یہ ترکیب غالباً شاعر کے مدیر جناب افتخار امام صاحب نے مشہور کی۔ خاص نمبر نکالے اور اس

طرح اب یہ ایک مستند ترکیب بن گئی ہے۔ میں نے تو ہندوستان کے مختلف شہروں میں غالباً بیالیس شہر دیکھے ہیں۔ یہ محسوس کیا کہ ہر علاقہ اور ہر شہر میں ایک اردو بستی جداگانہ طور سے وجود رکھتی ہے۔ کچھ یہی حال ہندوستان اور پاکستان سے باہر کا ہے۔ میں نے لیبیا' امریکہ' کویت' لندن اور کئی ممالک میں دیکھا کہ وہاں پر باذوق اردو ادب پڑھنے' لکھنے اور بولنے والوں کی خاطر خواہ تعداد ملتی ہے۔ اردو کی شاعری چاہے مشاعرے میں ہو' چاہے ادبی محفلوں میں ہو' چاہے تحریر وتقریر میں ہو ممیّز ومختار ہے۔ غیر اردو داں حضرات یہاں تک کہ عرب بھی شعر وسخن کے رسیا ہیں۔ اس بارے میں چند اہم نکات قابل غور ہیں۔ بہت سے لوگ نقل مکانی کر کے ان ملکوں میں معاشی اور سماجی وجوہ سے آ گئے ہیں۔ انگلینڈ' امریکہ اور کینڈا میں کچھ لوگ سیاسی اور نظریاتی سبب سے آ کر بھی رہ گئے ہیں۔ ان میں بہت سے لوگ اردو شعر وادب کے چاہنے والے اور تخلیق کار ہیں۔ لندن ہو' ٹورنٹو ہو' ماسکو' امریکہ کے شہر ہو' سعودی عرب' کویت' قطر' بحرین' عمان' امارت بلکہ یوروپ کے کئی ایسے شہر جہاں اردو والوں کی انجمنیں ہیں۔ مشاعرے بھی ہوتے ہیں' کتابیں بھی چھپتی ہیں' اخبارات بھی ہیں۔ اردو زبان کی تعلیم والے اسکول بھی ہیں (پاکستانی اسکول بھی)۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مخصوص طور پر اردو کے کورسیس بھی ہیں اس لیے اردو کی نئی بستیوں کی ترکیب بنی ہے۔

س: عالمی سطح پر مشاعروں کی موجودہ صورتحال پر آپ کی رائے کیا ہے۔

ج: اردو کی شہرت کا ایک ذریعہ مشاعرہ بھی رہا ہے لیکن آج مشاعرہ ابتذال' سیاسی اکھاڑہ اور جملہ بازی کا مرکز بنتا جارہا ہے جہاں سستی شہرت اور قبولیت عام کے لیے شاعر اور متشاعر دونوں ہی کوشاں ہیں۔ اچھی اور ادبی معیاری شاعری کے لیے آج نہ تو سامعہ راضی ہے اور نہ تو باصرہ موافق۔ یہ صورتحال ملک کے مشاعروں میں بھی ہے اور بیرونی ملک میں بھی۔ اس کے باوجود حقیقت یہ بھی ہے کہ ان نئی بستیوں میں جہاں متشاعر قسم کے لوگ بھی ہیں۔ اچھے' عمدہ اور تازہ تر کلام لکھنے والے شاعر بھی ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک بڑے نام ان ممالک غیر میں اردو کی شمع جلائے ہوئے ہیں۔

س: مشرق وسطیٰ میں مختلف ممالک کے اہل قلم کی نثری اور نظمیں کتابیں تواتر سے منظر عام پر آ رہی ہیں۔ کوئی خاص وجہ ؟

ج: حقیقت یہ ہے کہ کئی بین الاقوامی شہروں میں اس زبان کو چاؤ سے بولنے' لکھنے اور پڑھنے والے ملتے ہیں۔ اس لیے اردو ادب مہذب معاشرہ کا استعارہ ہے۔ وطن سے باہر رہنے والے اردو کے قلمکار معاشی زاویہ سے بہتری کے سبب دھڑا دھڑ کتابیں تصنیف وتالیف کر رہے ہیں اور طلب' مروجہ ادبی رویہ سے مبرّہ ہو کر خریداروں کے شوق سے بے اعتنا اپنی بغلوں میں کتابوں کے پلندے دبائے ہوئے اہل کتاب بنے پھرتے ہیں۔ تنقید کا میدان بری طرح متاثر ہوا ہے۔ ہر نثر نگار اپنے آپ کو بزعم میں خود تنقید نگار سمجھتا ہے اور چند دریافت شدہ تراکیب کے استعمال کے وسیلے سے لفاظی' مرکبات اور مصطلحات سے پُر بلکہ آلودہ نثر لکھنے کی کوشش کرتا ہے اور تاثر دینا چاہتا ہے کہ وہ تنقید کے فن میں کوئی مقام رکھتا ہے۔ اس ڈھونگ میں ارباب وطن بھی کچھ پیچھے نہیں ہے یعنی سراب نے چشمہ ہونے کا تماشہ رچا رکھا ہے۔

س: کیا الیکٹرانک میڈیا زبان کی ترویج کے لیے کارکرد ہوسکتا ہے؟

ج: مشاعرہ ہو' ٹی وی ہو' فلم اور سارے ہی ذرائع وترسیل اردو کی ترویج کیلئے لازم ہیں۔ اچھے شاعر کا کلام دیرپا اور متاثر کن ہوتا ہے۔ ہر درجہ کی فکر کے لوگ اپنی سوچ اور پسند کی بنا پر شعر پڑھتے ہیں اور پسند کرتے ہیں۔ کبھی کبھی تک بندی بھی مشہور عام ہوجاتی ہے۔ اس لیے اہل ادب کو احتیاط اور معیار کا خیال رکھنا چاہئے۔ ذہنی تربیت ان کے ذمہ میں ہے۔

س: بیرونی ممالک سے مشاعروں کے انعقاد کی خبریں بڑے اہتمام سے آتی ہیں۔ کیا اردو زبان کے لیے ادبی اجلاس اور سمیناروں کی ضرورت نہیں۔ ذرا اس بابت صورتحال کو واضح کریں۔

ج: جی نہیں صرف مشاعرے ہی اردو کی بقاء کے لیے نئی بستیوں کے لیے ضروری نہیں۔ مشاعرے تو کم ہوتے ہیں اصل بنیاد تو اردو زبان کا سماجی حلقوں اور محفلوں میں رواج ہے۔ مذہبی' ادبی' تفریحی انجمنوں کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جو ہر اردو بستی میں متحرک اور فعال ہیں۔

س: ابھی ابھی ادارہ پیکر اور حیدرآباد لٹریری فورم سے وابستہ تخلیق کار ساجد اعظم کی ایک کتاب ''فلمی نغموں کا سفر'' کے عنوان سے منظر عام پر آئی ہے۔ اردو ہال میں اس کی رسم اجراء میں جہاں شہر کی دیگر انجمنوں کے شاعر و ادیب شریک تھے ان میں حلف سے وابستہ بس چار اراکین نے شرکت کی۔ مابعد تقریب چند احباب کا خیال تھا کہ حلف میں سعودی عرب اور دیگر بیرونی ممالک سے لوٹنے والے تخلیق کاروں کو شامل کر کے حلف کی تجدید نو کی جائے اور اس کی باگ دوڑ نئے ہاتھوں میں دیدی جائے۔ اس باب میں آپ کی کیا حکمت عملی ہوگی؟۔

ج: ساجد اعظم بہت عمدہ افسانہ نگار اور اردو ادیب ہیں۔ پیکر کے دنوں میں ان سے ملنے اور ان کی باتیں سننے کا خوشگوار تجربہ مجھے بھی ہوا ہے۔ سُنا ہے کہ وہ تلگو زبان میں بھی مکالمہ نگاری اور تحریر و تقریر میں بھی خوب کامیاب رہے ہیں۔ ان کی نئی کتاب پر ان کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اردو کی اہم انجمنوں میں حیدرآبادی لٹریری فورم کی اہمیت کو بھلایا نہیں جاسکتا۔ اس انجمن سے حیدرآباد کی تقریباً سبھی زندہ ذہن ادیب و شاعروں کا تعلق رہا ہے۔ جدید ادب' ترقی پسند ادب دونوں کے اہم نام جو حیدرآباد میں مقیم تھے ان دنوں اس کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ جن جیالوں نے اس انجمن کی داغ بیل ڈالی تھی وہ بہت حد تک کامیاب ہوئے۔ میری رائے ہے کہ اس انجمن کو دوبارہ متحرک کیا جانا چاہئے تاکہ شعر و ادب کا ذریعہ رواں دواں رہے۔ ادبی محفلیں' ادبی تخلیقات کو جلا بخشتی ہیں۔ کوئی طریقہ کار اپنانا ہوگا جو مفادات حاصلہ سیاس اور افتراق پسند عناصر سے ایسی ادبی انجمنوں کو محفوظ رکھا جاسکے۔

س: آپ کی نگاہ میں اردو کا سب سے اہم مسئلہ کیا ہے؟

ج: محسن صاحب' یہ سچ ہے کہ اردو رسم الخط اب اتنا رائج نہیں رہا۔ اردو کے بہت سارے بولنے والے' چاہنے والے' اردو کے شعر و ادب کے رسیا' افسوس کہ اردو رسم الخط سے واقف نہیں ہے۔ کچھ تو پڑھ لیتے ہیں' کچھ لکھ نہیں پاتے۔ اکثر لوگ یہاں تک کہ شاعر و ادیب بھی دوسرے رسم الخط اور کبھی کبھی رومن میں لکھ کر اردو پڑھتے ہیں۔ اس صورتحال کے لیے بھی جلد از جلد قابل قبول حل ضروری ہے۔ اردو رسم الخط کو عام کرنے کے لیے حتی المقدور کوشش ضروری ہے۔

س: نامور نقاد ڈاکٹر مغنی تبسم نے آپ کے شعری مجموعہ ''اگلے موسم کا انتظار'' پر لکھا تھا کہ اسلم عمادی نے غزل کو نئی سمت اور رفتار بخشی اور داخلی واردات کی ترجمانی کے ساتھ عصری حسیت کا اظہار کا ذریعہ بنایا۔ انہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر نئے علامتی پیکر تراشے اور ایمائیت کے نئے اسالیب اختراع کئے۔ جدید غزل کو ایک نیا لہجہ اور آہنگ دیا۔ اس تناظر میں قارئین کے لیے کیا آپ یہ بتلانے کی زحمت کریں گے کہ آخر جدید شاعری کے امتیازات کیا رہے ہیں؟

ج: موجودہ زندگی ایسی رزم گاہ ہے جس کا ہر سپاہی اپنی جان کی حفاظت کے لیے لڑ رہا ہے۔ یہ ایک ایسا غیر منظم مرحلہ ہے کہ اپنی خصوصیات کو واضح اور منفرد رکھنے کا امکان نایاب ہے۔ جدید شاعر پیغمبری کا دعویٰ نہیں کرتا۔ وہ اپنے احتجاج کو غیر بیانیہ لیکن طاقتور لہجہ میں پیش کرتا ہے۔ تنہائی' حصار ذات' فرد کی شکست و ریخت کی زندگی کی بے معنویت' احساس مرگ' خوف و ہراس' خود شکستگی اس شاعری کے موضوعات ہیں۔ نئی شاعری

گھناونے ماحول کے خلاف احتجاج کرتی ہے اور زندگی کی رزم گاہ میں مسائل سے نبرد آزما ہے۔

س: آپ کی تعلیم کے مراحل بڑے دلچسپ رہے ہیں۔ آپ میری اس سرزمین سے وابستہ رہے جہاں میں نے اپنی عمر کا اسّی فیصد عرصہ گذارا۔ اذرا! ادب سے ہٹ کر اس سلسلہ میں بھی کچھ بتلانے کی کوشش کریں گے؟

ج: میری ابتدائی تعلیم سکندرآباد کے ملٹری اسکول میں ہوئی کیونکہ میرے والد انڈین آرمی میں تھے۔ صرف 2 سال بعد جون پور جانا پڑا وہاں اسلامیہ اسکول میں تاریخی اٹالہ مسجد میں تعلیم حاصل کی۔ ڈھائی تین سال بعد میں حیدرآباد آ گیا اور یہاں مڈل اسکول اور میٹرک کی تعلیم حاصل کی۔ میٹرک میں نے چادرگھاٹ ہائی اسکول سے 1964ء میں کیا میں نے ہمیشہ امتیازی کامیابی حاصل کی اور پھر عثمانیہ یونی ورسٹی انجینئرنگ کالج حیدرآباد سے 70-1965 تک بی اے میکانیکل کی تکمیل کی۔

س: اسی سے جڑے ایک سوال کا جواب بھی دیجئے کہ آپ بیرونی ملک تقریباً تین دہوں سے مقیم ہیں۔ کاروبار معاش میں آپ کی کہاں کہاں' کیا کیا مصروفتیں رہیں؟

ج: ایک آئیل کمپنی میں میری ملازمت 87-1981 لیبیا میں رہی 1989 سے تاحال کویت آئیل کمپنی میں بحیثیت Specialist Technical Expertees برسرکار ہوں۔

س: آپ نے بڑی تعداد میں نظمیں کہی ہیں اور غزلیں بھی۔ آپ بتائیں کہ آپ کا جی غزل میں زیادہ لگتا ہے کہ نظم میں؟

ج: میں غزل کی بہ نسبت نظم کو ترجیح دیتا ہوں کہ نظم کہتے وقت میری تخلیقی حسیت مرتکز ہو جاتی ہے۔

س: ایک آخری سوال' کچھ خود ساختہ دانشور کہتے ہیں کہ جدیدیت کا دور ختم ہو گیا اور ادب میں مابعد جدیدیت کی رو چل رہی ہے۔ اس سلسلہ میں آپ کی ذاتی رائے کیا ہے؟

ج: تراکیب و اصطلاحات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اچھی شاعری ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ جدید رجحان ہرگز ختم نہیں ہوا ہے۔ میری دانست میں مابعد جدیدیت کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ دراصل جدید شاعری کا تسلسل ہے۔

م۔ج: اسلم صاحب اس گفتگو کے لیے آپ نے بہت وقت دیا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ!

اسلم عمادی: مجھے بہت خوشی ہے بڑے برسوں بعد آپ کے ساتھ اچھا وقت گذرا اور کئی فراموش شدہ یادیں تازہ ہو گئیں۔ آپ کو صرف دور افتادہ شاعر کے طور پر جانتا تھا لیکن آپ نے روزنامہ اعتماد کے توسط سے اپنے تحقیقی و تنقیدی مضامین' تبصروں' تجزیاتی مطالعوں' بالخصوص انٹرویوز سے اپنی شاعرانہ شخصیت کے ساتھ بحیثیت نثر نگار بھی شناخت بنائی ہے۔ میری نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم (اقامتی و غیر اقامتی ادارہ)

شاہی ہلز شاہین نگر حیدرآباد

زیر انتظام: شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد

Ac No: 1327104000065876 Bank Name: IDBI
AcN: SHIBLI INTERNATIONAL ADUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST
IFS: IBkL0001327. Branch: Charminar Hyderabad (T.S)

بانی و ناظم: مولانا ڈاکٹر مفتی محمد محامد ہلال اعظمی۔ موبائل: 9392533661

سید حسن عباس۔ ریسرچ اسکالر پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ

اردو ادب میں ڈرامے کا مقام

ڈرامہ نویسی یا تمثیل نگاری اس فن کا نام ہے جس کے ذریعہ سے کسی عشقیہ، اخلاقی، سیاسی یا مذہبی حکایت یا واقعۂ تاریخی سے تعلق رکھنے والے افراد کے کردار، طرز کلام، بود و باش، ماحول اور لباس وغیرہ کی ہو بہو نقل اتاری جاتی ہے۔ تمثیل نگار اپنے اس فرض کو نبھانے کی پوری پوری کوشش کرتا ہے کہ اس کے افراد کے کارناموں اور ان پر گذرنے والے حالات و واقعات کو اصل وضع قطع، رنگ ڈھنگ اور خوبو میں پیش کیا جائے۔ گویا تمثیل کے لئے ضروری ہے کہ اسے ہر اعتبار سے حقیقت اور فطرت کے ساتھ مکمل مطابقت ہو۔ ارسطو نے کہا ہے کہ انسان فطری طور پر محاکات یعنی تمثیل، نقل، شبیہ، مشابہت یا تقلید پسند کرنے والا واقع ہوا ہے۔ اسی لئے جب بندر انسان کے افعال کی نقل کرتا ہے یا بچہ بڑوں کی نقل اتارتا ہے یا طوطا انسانی آوازوں کی پیروی کرتا ہے تو ہم سب کو ایک گونہ لطف محسوس ہوتا ہے۔ اور یہی لطف ہے جو ہمارے جذبات پر ایک گہرا اور رنگین سا نقش چھوڑ جاتا ہے۔

اگرچہ فن تمثیل کی ابتدا کہیں تاریخ کے اوراق پریشاں میں کھوئی ہوئی ہے۔ تاہم اس حقیقت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ سب سے پہلے ہندوؤں ہی نے اسے اپنایا تھا۔ آریہ قوم نے ناٹک کو ایک قومی و مذہبی ضرورت کے طور پر ترقی دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ہندوستان کی بھاٹ بہروپیے، راس دھارے، بھگت باز اور بعد میں مراثی اور مرثیہ خواں وغیرہ آریہ قوم کے اسی قدیم عہد کی یادگار ہیں۔ ڈرامہ اردو ادب میں انیسویں صدی میں داخل ہوا اور اب تک بہت ترقی کر چکا ہے۔ اس کی ابتداء ہندی ناٹکوں کے ترجمے سے ہوئی۔ بہت سی دیسی منڈلیاں بھارت کے دیہات میں مذہبی کھیل دکھاتی پھرتی تھیں۔ واجد علی شاہ نے غالباً انہی منڈلیوں سے ناٹک کا پہلا سبق سیکھ کر اپنے محل میں اندر کا اکھاڑہ جمایا۔

اسلامی نظمیں اور روایات پر اردو ڈرامے کا عنصر غالب ہے۔ اردو نظم عاشقانہ رنگ اور ڈرامہ نگاری کے لئے خاص موزونیت رکھتی ہے اور نثر بھی رزم و بزم، جذبات نگاری، غرض ہر موقع پر نہایت پُر زور طریقے سے کام دے سکتی ہے۔ اردو سٹیج آج کل کے انگریزی ڈراموں کے ترجموں سے بھرا ہوا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انگریزی سٹیج کی ایک ایک جھلکی اردو ڈرامے کے ایک ایک چھل بل سے چھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ہمارے یہاں تھیٹر کی ساخت پردے، لباس، نشستوں کا انتظام، تماشے کی تقسیم وغیرہ انگریزی ڈرامے ہی کے اصولوں پر عمل میں آتے ہیں۔ اردو میں سب سے پہلا ڈرامہ اندر سبھا ہے جسے ناسخ کے شاگرد امانت نے لکھا۔ اس کی مقبولیت دیکھ کر مداری لال نے بھی ایک اندر سبھا لکھی پھر کیا تھا امیر کاروباری پارسی میدان اتر آئے۔ انہوں نے دہلی، کلکتہ اور بمبئی میں انگریزی تھیٹروں کی نقل پر کچھ کمپنیاں قائم کر دیں۔ اس وقت ڈرامے ایسی اردو میں لکھے جاتے تھے جو ہر طبقہ کے لوگ آسانی سے سمجھ سکتے تھے۔ اندر سبھا کی تقلید میں ڈراموں کے اکثر حصے منظوم ہوتے تھے۔ رونق بنارسی اور میاں حسین ظریف نے اوریجنل تھیٹریکل کمپنی کے لئے بہت ڈرامے لکھے۔ رونق انگریزی سے بھی ترجمہ کرتے تھے۔ ظریف کے ڈراموں میں سے نتیجہ عصمت، خداداد ست، چاند بی بی اور بلبل بیمار بہت مشہور ہیں۔

منشی ونایک پرشاد طالب بنارسی نے وکٹوریہ ناٹک کمپنی کے لئے بہت سے مقبول عام ڈرامے لکھے۔ انہوں نے ڈرامہ کی زبان اور مضامین کو بہت ترقی دی۔ وکرم ولاس، نگاہ و غفلت، ہریش چندر اور گوپی چند ان کے مشہور ڈرامے ہیں۔ الفریڈ تھیٹریکل کمپنی

کے ڈرامہ نگار احسن لکھنوی ایک خوش گو شاعر تھے۔ان کے ڈراموں کی زبان نہایت با محاورہ اور صاف ہے۔ان کی مقبول تصانیف ہیں۔فیروز گلنار، چندراولی، دل فروش، بکاؤلی اور چلتا پرزہ احسن کے بعد پنڈت نرائن پرشاد بیتاب دہلوی الفریڈ کمپنی کے لئے نئے نئے ڈرامے لکھتے رہے۔وہ بمبئی سے ایک رسالہ شیکسپیئر بھی نکالتے تھے جس میں مشہور ڈراموں کے اردو تراجم شائع ہوتے تھے۔بیتاب کے مشہور ڈرامے ہیں: قتل بے نظیر مہابھارت، فریب محبت، رامائن، گورکھ دھندا اور کرشن سدامار۔ بیتاب کے ہندی دوہے اور گیت نہایت شیریں، جذبات عمیق اور کیریکٹرز بردست ہیں۔

اردو ڈرامہ نگاری کے عروج کا زمانہ آغا حشر کاشمیری سے شروع ہوتا ہے۔انہوں نے نیو الفریڈ کمپنی کے لئے بہت سے ڈرامے تصنیف اور ترجمہ کئے۔آغا حشر کو کئی لوگ اردو کا مارلو کہتے ہیں۔ کئی لوگ انہیں ہندوستان کے شیکسپیئر کا نام دیتے ہیں۔حشر اپنے کرداروں میں جذبات بہت کثرت سے دکھاتے ہیں۔اور نثر و نظم دونوں پر خاصہ عبور رکھتے ہیں انہوں نے ایک اپنی کمپنی بھی جاری کی تھی اور کچھ مدت تک میڈن تھیٹر کلکتہ میں ملازمت کی۔شہید ناز، ترکی حور، خوبصورت بلا اور سفید خون حشر کے کامیاب ڈرامے ہیں۔ان کے ہندی ڈرامے سورداس اور سیتا بن باس بھی بہت قبول ہوئے تھے۔حشر نے ۱۹۳۵ء میں وفات پائی۔

بیسویں صدی شروع کے ڈرامہ نگاروں میں منشی غلام علی دیوانہ، محشر انبولوی، دوارکا پرشاد اُفق (مصنف رام ناٹک) مرزا عباس، لالہ کشن چندر یا لالہ کنور سین۔ بشمبر سہائے بیاکل (مصنف بدھ دیو) منشی جانخیر پرشاد، مائل دہلوی، حکیم احمد شجاع، سید امتیاز علی تاج اور مہاشہ سدرشن کے نام قابل ذکر ہیں۔اردو ڈرامے کو عصری آگہی، قدیم وجدید کی کشمکش اور قومی زندگی کے گوناگوں مسائل کا وسیلہ اظہار بنانے والے ڈرامہ نگاروں میں امتیاز علی تاج اور سید عابد حسین کا نام سرفہرست ہے۔ امتیاز علی تاج کا شہرۂ آفاق ڈرامہ انارکلی، بہترین ڈراموں میں شمار ہوتا ہے۔ان کے علاوہ اشتیاق حسین قریشی اور پروفیسر محمد مجیب نے ڈرامے میں سنجیدگی، فکری بالیدگی اور معنوی گیرائی پیدا کی۔

رومانوی ڈراموں کے علاوہ اردو میں کئی ادبی، سوشل اور سیاسی ڈرامے بھی لکھے گئے ہیں۔شرر اور علامہ کیفی دہلوی نے اصلاح معاشرت کے لئے اچھے ڈرامے لکھے ہیں۔ سیاسی ڈراموں میں زیبا کا زخمی پنجاب خوب ہے۔

کرشن چندر، اشک، بیدی، منٹو، عباس، عصمت، خواجہ احمد عباس، انتظار حسین اور ڈاکٹر محمد حسین وغیرہ اخلاق آموزی کے بجائے حقیقت نگاری کی طرف زیادہ دھیان دے رہے تھے۔ان ڈرامہ نگاروں نے اردو ڈرامے کو نئی معنویت اور فنی لطافت بخشی۔ زندگی کے پیکار و تصادم اور متعلقہ عہد کے اُبھرتے ہوئے تقاضوں کو اپنے ڈراموں کا موضوع بنایا اور اس میں انسانیت اور دردمندی کے احساس، نفسیاتی تجزیہ اور لطیف ظرافت کے عناصر شامل کر کے اردو ڈرامے کو عوام کے سطحی معیار سے اونچا اٹھا کر دیگر اصناف ادب کی طرف عظمت و وقار اور ایک منفرد ادبی شان بخشی۔ان کے ڈراموں میں نفسیات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔زبان میں بے تکاپن اور ڈینگ بازی کم ہے۔نظری نقطۂ نظر سے ڈراموں کو حقیقت مشاہدہ اور قیاس کے قریب لایا جارہا ہے۔مثلاً یہ نہیں ہوتا کہ کوئی شخص اپنے کسی عزیز کی موت کے وقت اس کے سرہانے بیٹھ کر گانا شروع کردے یا دو دشمن تلوار کی بجائے اشعار سے لڑائی کا میدان گرم کرنے لگیں۔کیریکٹر کے اتحاد کو فراموش نہیں کیا جاتا۔ایسا نہیں ہوتا کہ ایک سنجیدہ شخص کے منہ سے ایک بھانڈ کی سی باتیں ٹپکنے لگیں۔

خوشی کی بات ہے کہ اس تمثیل نگاری میں مقفیٰ عبارت نے صاف، سلیس اور فطرت زبان کے لئے میدان خالی کردیا ہے۔کہانی کے واقعات کسی خاص مقصد کے گرد گھومتے ہیں۔ڈرامائی عمل کی موافقت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور رفتار واقعات ہمیشہ اعتدال پر رہتی ہے۔دوسری طرف بڑے رنج کا مقام ہے کہ فلمی لعنتوں کی بدولت ڈرامہ نگاری پرلے درجے کے نااہل ہاتھوں میں پہنچ کر حقیقت، اخلاقی اثر اور شائستگی کا خون کررہی ہے۔غیر فطری اتفاقات کا سہارا لینا، لوازم تماشا گاہ میں حقیقت کو نظر انداز کرسکے

بے لگام تزئین وآرائش پر نظر رکھتی۔ مغربی ڈراموں کی اندھا دھند تقلید، جا وبیجا گیتوں کی بھرمار شعریت سوز تک بندیوں کی افراط اور فرسودہ وپامال مضامین کو بار بار دہراتے جانا ایسی روح فرسا خامیاں ہیں کہ اردو ڈرامہ انہیں اپنی ترقی یافتہ صورت میں کسی طور بھی برداشت نہیں کرسکتا۔

اردوادب میں ڈرامے نے اس دور میں ایک نہایت اہم مقام حاصل کیا ہے۔ اُن دنوں پرتھوی راج کپور اور مانک لال نئی قسم کی اسٹیجوں پر اس سے بہت قیمتی کام لے رہے تھے۔ ایک عرصہ ہوا علامہ عبداللہ یوسف علی نے فرمایا تھا:

''اردو ڈرامہ بہت زور دار ترقی کے آثار پیدا کرچکا ہے۔ اس میں ایک زبردست وسیلہ قومی ترقی کا نظر آتا ہے۔ اب ہمارے ہاں تاریخی اور سیاسی ڈرامہ نگاری کی بہت ضرورت محسوس ہورہی ہے۔ کیونکہ اسی ڈرامے کی ترقی کا راز مضمر ہے''۔

ہندوستان کو آزاد کیے بعد اب سیاسی ڈراموں کی بجائے معاشرتی ڈرامے زیادہ ضرورت محسوس ہورہی تھی۔ ملک کے تقسیم ہوجانے کے باعث اردو ڈرامہ ہندوستانی کی راہ سے ہندی کی طرف جارہا تھا۔ ہندی میں اچھے ڈراموں کی بہت کمی تھی۔ چنانچہ ہمارے اردو ڈرامہ نگاروں کی توجہ اس وجہ سے بھی ہندی کی طرف مائل ہونے لگی ہے۔

ادب میں ڈرامہ کے مقام کی بلندی اسی حقیقت سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ مختلف اصناف ادب کی اکثر بکھری بکھری خوبیاں ڈرامے میں آکر جمع ہوجاتی ہیں۔ ہر قسم کی نثر، ہر قسم کی نظم ڈرامے میں ہی یکجا ہوتی ہے۔ مکالمے کی برجستگی مقالہ نگاری کا کمال، مختصر افسانے کی کفایت الفاظ، ناول کی حقیقت نگاری، یہاں تک کہ شعر کی مانند جذبات کی تصویر کشی، یہ سب ادبی عناصر باہم مل کر ڈرامہ کو وجود میں لاتے ہیں۔

ڈراما اور ناول میں فرق یہ ہے کہ ناول میں مصنف کہانی کہنے والے کی حیثیت سے خود موجود رہتا ہے۔ چنانچہ مصنف کا بیان کرداروں کی باہمی گفتگو کے ساتھ مل کر، پلاٹ، یعنی کہانی کو مکمل کرتا ہے۔ لیکن ڈرامے کا انحصار مکالمے پر ہوتا ہے۔ یہاں مصنف اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا۔ اس کے کرداروں کی بات چیت کہانی کو آگے چلاتی ہے۔ اس کڑی پابندی سے ڈرامہ کی ساخت خوب چست رہتی ہے۔ ناول کا پلاٹ ڈھیلا ڈھالا ہوتو ہو، لیکن ڈرامے میں (مختصر افسانے کے مانند) رطب ویابس کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ یہاں ہر فقرہ جو کسی کردار کے منھ سے نکلتا ہے یا تو کہانی کو آگے چلاتا ہے اور یا بولنے والے کی اپنی یا ڈرامہ کے کسی دوسرے کردار کی سیرت کا اظہار کرتا ہے۔

ناول کو ایک ایسی آسانی ضرور حاصل ہے جو ڈرامہ کو میسر نہیں۔ ناول کا مصنف اپنی ایک جنبش قلم سے جہاں چاہے ہمیں لے جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دل کی ان باتوں کا حال بیان کرسکتا ہے جو زبان تک نہیں آسکتیں لیکن دوسری طرف ڈرامے کو بھی ایک خصوصیت ایسی حاصل ہے جس سے ناول محروم ہے اور وہ ہے مکالمے پر انسانی حرکات وسکنات کا اضافہ۔ اس خیال سے کہ آپ ادب میں ڈرامہ کے مقام کا صحیح اندازہ کرسکیں۔

شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد کے زیر اہتمام ایک روزہ قومی سیمینار بعنوان ''گاندھی جی اردو ادیبوں اور شاعروں کی نظر میں'' کے موقع پر اسریٰ تسنیم کی پہلی تصنیف ''فکر وتحقیق کا وضاحتی اشاریہ'' ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی، ڈاکٹر مختار احمد فردین، ڈاکٹر ناظم علی، پروفیسر مجید بیدار، پروفیسر صدیقی محمد محمود، مولانا فہیم الدین، سردار نانک سنگھ نشتر، محمد انور خان ایڈوکیٹ اور مولانا حکیم صوفی خیر الدین قادری صوفی کے ہاتھوں رسم اجرا

گاندھی جی اپنے فلسفے اور افکار کے ساتھ آج بھی زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے: پروفیسر صدیقی محمد محمود

گاندھی جی کے ۱۵۰ ویں یوم پیدائش پر شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد کے زیر اہتمام یک روزہ قومی سیمینار کا انعقاد

خطاب کرتے ہوئے پروفیسر صدیقی محمد محمود، ڈاکٹر مختار احمد فردین، ڈاکٹر ناظم علی، پروفیسر مجید بیدار، ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی، مولانا حافظ فہیم الدین، سردار نانک سنگھ نشتر اور محمد انور خان ایڈوکیٹ

حیدرآباد: شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد کے زیر اہتمام اردو گھر مغل پورہ میں یک روزہ قومی سیمینار بعنوان ''گاندھی اردو ادیبوں اور شاعروں کی نظر میں'' کا انعقاد ہوا۔ کلیدی خطبہ دیتے ہوئے پروفیسر مجید بیدار سابق صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد نے گاندھی کے فلسفے اور ملک کے حالات پر تفصیلی خطبہ دیا۔ انہوں نے کہا کہ مہاتما گاندھی کسی ایک قبیلے، فرقے اور مذہب کے رہنما نہیں تھے بلکہ وہ سبھی مذاہب کے حامی تھے، انہوں نے ہندوستان میں سب سے پہلے مسلم طبقے سے حمایت حاصل کی اور تحریک خلافت نے گاندھی کو مہاتما گاندھی بنادیا، جس کا سہرا مولانا محمد علی جوہر کے سر جاتا ہے۔ گاندھی کے فلسفے عدم تشدد پر چلنا انتہائی ضروری ہے، مگر آج کے حالات بتا رہے ہیں کہ حکومت گاندھی کے فلسفے عدم تشدد کو بھول کر ہندوتوا کے فلسفے کی راہ پر چل رہی ہے، اس لیے آج کے دور میں گاندھی کے فلسفے کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جب ہندوستان آزاد ہوگیا تو گاندھی جی نے کہا تھا کہ حضرت عمر جیسی حکومت ہونی چاہئے۔ مہمان خصوصی پروفیسر صدیقی محمد محمود ڈائرکٹر سی پی ڈی ایم ٹی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ ہندوستان کی تاریخ میں بلا مبالغہ دو شخصیت نظر آتی ہے۔ ایک مولانا ابوالکلام آزاد، دوسرے مہاتما گاندھی، جنہوں نے گہرائی سے نظام تعلیم کو مرتب کیا۔ آج کے حالات کے تناظر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ ملک جس میں مہاتما کے عدم تشدد کا فلسفہ تھا، جس ملک کو گاندھی نے ستیہ گرہ کی راہ دکھائی، وہ ملک جس میں گاندھی نے سچائی پر عمل کر کے دکھایا۔ آج اسی ملک میں گاندھی جی کا مجسمہ تک محفوظ نہیں ہے۔ کیا نفرت کی آندھی گاندھی جی کے اعلیٰ اصولوں کو بہالے جائے گی۔ کیا محبت کی لے اتنی کمزور ہے، آج محبت کو بڑھاوا دینے کی ضرورت ہے۔ محبت کے پیغام سے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

ڈاکٹر مختار احمد فردین صدر آل انڈیا اردو ماس سوسائٹی فار پیس نے کہا آج کے سیمینار کا موضوع بڑا اہم ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس سیمینار کے ذریعہ ہماری نوجوان نسل اپنے شاعروں اور ادیبوں کو پڑھ کر گاندھی جی کے افکار کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ بڑا مستحسن قدم ہے۔ ڈاکٹر ناظم علی نے کہا کہ گاندھی جی نے ہندو مسلم سکھ، عیسائی اتحاد اور ہندوستانی زبان کو بالخصوص ہندی اور اردو کو فروغ دینے کی بات کہی۔ محمد انور خان ایڈوکیٹ نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ گاندھی جی ایک وکیل تھے اور وہ سچائی کے علم بردار تھے، اس پر انہوں نے کسی معاملے میں سمجھوتہ نہیں کیا۔ سردار نانک سنگھ نشتر نے کہا کہ میں گاندھی جی میں بہت ساری کمیاں دیکھتا ہوں لیکن وہ اچھے انسان تھے۔ مولانا صوفی خیر الدین شاہ قادری نے گاندھی جی کو ۱۵۰ ویں سالگرہ کے موقع منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ عارف الدین احمد، محمد تمیز الدین احمد نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا، محمد مکاشف ہلال نے تلاوت کلام اللہ کی اور رفیق مدراسی نے حمد اور نعتؐ پیش کیا۔ مولانا حافظ فہیم الدین مہمان اعزازی کی حیثیت سے شریک رہے۔

اس سیمینار میں مندرجہ ذیل ڈاکٹروں اور ریسرچ اسکالروں نے مقالے لکھے اور پیش کئے۔ ڈاکٹر غوثیہ بانو (گاندھی جی خورشید احمد جامی کی نظر میں)، ڈاکٹر سمیہ تمکین (اردو شاعری مہاتما گاندھی کی شخصیت کا مختصر جائزہ)، ابو ہریرہ یوسفی (مہاتما گاندھی اردو صحافیوں کی نظر میں)، فریدہ بیگم (مولانا آزاد کی نظر میں گاندھی جی)، اسریٰ تسنیم (گاندھی اردو ادیبوں اور شاعروں کی نظر میں) ڈاکٹر جرا ر احمد (بچوں کا ادب اور باپو) ڈاکٹر محمد نہال افروز (اردو ہندی لسانی تنازعہ اور گاندھی جی)، تبسم آراء (اردو ادیبوں اور شاعروں میں گاندھی جی)، ڈاکٹر نوری خاتون (مہاتما گاندھی ترقی پسند شعراء اور ادبا کی نظر میں)

،ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی (گاندھی جی اور شمیم کرہانی)، محمد آصف ظفر (اقبال سہیل کی شاعری میں گاندھی جی کی معنویت)۔اس سیمینار میں اسریٰ تسنیم کی پہلی تصنیف ''فکر و تحقیق کا وضاحتی اشاریہ'' کا رسم اجرا پروفیسر مجید بیدار کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس سیمینار کے کنوینز ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی نے تمام مہمانوں، مقالہ نگاران حاضرین محفل، معاونین اور میڈیا والوں کا شکریہ ادا کیا۔

جامعة البنات الاصلاحية حیدرآباد (ملک پیٹ)

لڑکیوں کی اعلیٰ دینی وعصری تعلیم کا فکری واصلاحی معیاری مرکز

شعبہ جات: تحفیظ القرآن الکریم ★ شعبہ ابتدائیہ (دوسال) ★ شعبہ عالمیت (چارسال) ★ شعبہ فضیلت (دوسال)

☆شہر سے اہم مقامات سے آمد ورفت کی سہولت ☆دور دراز کی طالبات کے لیے ہاسٹل کا نظم ☆عثمانیہ یونیورسٹی سے میٹرک تا ایم۔اے امتحانات دلوانے کا نظم

لڑکیوں کے لیے قرآن، حدیث، فقہ، ادب، سیرت، تاریخ کے علاوہ انگریزی زبان کے اعدادیہ تا فضیلت چھ سال تعلیم کا بہترین نظم ہے

رابطے کے لیے پتہ:
JAMIATUL BANAT AL-ISLAHIYAH
#16-3-993/1, NEAR DAWN HIGH SCOOL
OFFICERS COLONY, NEW MALAKPET,
HYDERABAD(T.S) INDIA 500036

نصب العین: انقلاب بذریعہ تعلیم قرآن وسنت کی گہری بصیرت، شہادت حق، احیائے دین کی استعداد اور امت کے لیے داعیانہ، مجاہدانہ اور قائدانہ کردار کی حامل ''المرأة الصالحة'' ٹیم کی تیاری۔

☆شعبہ تحفیظ القرآن اور شعبہ ابتدائیہ وعالمیت کے پہلے سال میں داخلے سال بھر جاری رہیں گے۔ اعلیٰ دینی تعلیم کے حصول کے خواہشمند سرپرست حضرات سے اپنی لڑکیوں کے ہمراہ جلد رجوع ہونے کی خواہش کی جاتی ہے۔

جامعة البنات الاصلاحیة حیدرآباد کا استحکام وقت کا اہم تقاضہ اور ملی فریضہ ہے۔ اس اہم مرکز کی تعمیر وترقی ک لیے مالی اور اخلاقی تعاون فرما کر ہمارے حوصلے کو قائم رکھیں۔

ناظم: مولانا عبدالعلیم اصلاحی
موبائل 9676202819

DR. S.J HUSSAIN
MD (Unani)
Former director Incharge
Central Research Institute Of Unani Medicine
Govt of India

website: www.unanicentre.com
Email:syedjalilhussain@gmail.com
jaleel_hussain@yahoo.com

Dr. Jaleel's

یونانی سینٹر فار کارڈیک کیر
UNANI CENTER FOR CARDIAC CARE

Consultation Time
Morning:11:00 am to 2:30 pm-Evening:7:00 pm to 9:30 pm
(Friday Morning and Sunday Evening Closed)

Cell:
+91 8142258088
+91 7093005707

Adress -: No: 8-1-332/3/B-69, RoadNo 1(A)Arvind Nagar Colony Tolichowki Hyderabad - 500008 T.S India